۱۴

تعلیم و تربیت

ششماہی علمی تخصصی

شمارہ: ۱۴ اپریل ۲۰۲۵-اکتوبر ۲۰۲۵

صاحب امتیاز: مجتمع آموزش عالی فقہ

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد لطیف مطہری ایڈیٹر: ڈاکٹر شجاعت علی کریمی

ہیئت تحریریہ:

محمد لطیف مطہری	(PH.D) پی ایچ ڈی فقہ تربیتی
رجب علی افتخاری	(PH.D) پی ایچ ڈی فقہ تربیتی
سید عباس موسوی	(PH.D) پی ایچ ڈی فقہ تربیتی
غلام مرتضی انصاری	(PH.D) پی ایچ ڈی فقہ تربیتی
محمد کاظم شریفی	(PH.D) پی ایچ ڈی فقہ تربیتی
شجاعت علی کریمی	(PH.D) پی ایچ ڈی فقہ تربیتی
محمد حسین حافظی	(PH.D) پی ایچ ڈی طالب علم

ایڈریس: قم، میدان شہدا، خیابان حجتیہ، مجتمع آموزش عالی فقہ (مدرسہ حجتیہ)
انجمن علمی پژوہشی فقہ تربیتی
ویب سایٹ: www.ftarbeyat.com
ای میل: latifmutahari۸۳@yahoo.com

فہرست مطالب

شمار	عنوان / مؤلف	صفحہ
۱	فقہ تربیتی کا مطالعہ	۶-۴
۲	رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خامنہ ای (مدظلہ العالی) کا حوزہ علمیہ قم کے یوم تاسیس کی مناسبت سے منعقدہ سیمینار کے نام پیغام / چیف ایڈیٹر	۳۰-۷
۳	اسلام میں جوان اور جوانی کی اہم ترین خصوصیات / ڈاکٹر محمد لطیف مطہری	۵۲-۳۱
۴	اسلامی انقلابِ ایران، انقلابِ روس اور فرانس کا تقابلی جائزہ / قمر عباس نانجی	۷۰-۵۳
۵	قرآن وسنت کی روشنی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی ضرورتیں / موسی خان	۹۷-۷۱
۶	قرآن کریم میں انبیاء الہی کا علوم / غلام مہدی آخوندزادہ	۱۱۶-۹۸
۷	مظلوم کی حمایت اور ظالم کے خلاف جہاد نہج البلاغہ کی روشنی میں / محمد تقی قاضی	۱۳۸-۱۱۷
۸	قرآن کی روسے، احسان اور (شاگرد—مدار) تعلیمی ماڈل / سیّد شعیب عابدی، سید	۱۳۹-۱۶۳

فقہ تربیتی کا مطالعہ

تعلیم و تربیت خواہ اجتماعی نظام ہو یا جوانوں اور نوجوانوں کی فکری، عاطفی اور رفتاری انقلاب، معاشرے اور خاندان کے بزرگوں کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے کہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنے جوانوں کی تعلیمی اور فکری تربیت کے لئے زمینہ فراہم کریں۔ فقہ وہ علم ہے جو انسانوں کے لئے احکام اسلامی (واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام) تعیین کرتی ہے اور انسان کی زندگی کے ہر شعبے میں اس کی جسمانی اور روحانی اختیاری افعال میں عمل دخل رکھتی ہے۔ اور ہر ایک مکلف افراد، گروہ اور معاشرے کی ذمہ داریوں کو مشخص کرتی ہے۔ اسلام کے احکامات علم فقہ میں نمایاں ہوتے ہیں، اور فقہ کا علم انسانوں کے تمام اختیاری افعال کے لئے حکم معین کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس طریقہ سے انسان کی ذمہ داریوں کے لئے منظم پروگرام اور «طرز زندگی» کے لئے جامع نظام تیار کرتا ہے۔ فقہ اسلامی کے اعتبار سے، مکلف کے تمام اختیاری اعمال کی طرح، تعلیمی و تربیتی طرز عمل کے لئے بھی حکم موجود ہے۔ فقہ تربیتی تعلیم و تربیت سے منسلک افراد کے اختیاری افعال کے لئے اجتہاد اور منطقی طریقہ سے حکم استنباط اور معین کرتا ہے۔ شعبہ تعلیم و تربیت کی ضرورت حوزوی مراکز میں باقی سارے تعلیمی شعبے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ حوزہ علمیہ کا ادعا ہے کہ وہ سماج اور معاشرے کی اصلاح اور تعلیم و تربیت، تبلیغ دین اور اسلامی معارف کی نشر و اشاعت کا علمبردار ہے۔ اس لئے لوگوں کی شرعی ذمہ داریوں کی تشخیص اور تعیین کو اپنا وظیفہ سمجھتی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ علمی میدان میں یہ شعبہ زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔ مجلہ تعلیم و تربیت انجمن فقہ تربیتی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مقالات کا محور:

۱۔ فقہ تربیتی کا فلسفہ
۲۔ فقہ تربیتی کا طریقہ کار
۳۔ فقہ تربیتی کا تاریخی پس منظر
۴۔ فقہ تربیتی میں تقابلی مطالعات
۵۔ احکام شرعی سیکھنے کے اصول (مواد، محتوی، ٹکنیک اور طالب علموں کی قابلیت)
۶۔ تدریس کے شرعی احکام
۷۔ تعلیم وتربیت کے شرعی احکام (جسمانی، عقلی و عقیدتی تربیت وغیرہ)
۸۔ تربیت فرزند کے بارے میں گھر والوں کی شرعی ذمہ داریاں
۹۔ تربیت فرزند کے بارے میں حکومت کی شرعی ذمہ داریاں
۱۰۔ تربیت فرزند کے بارے میں دیگر اداروں کی شرعی ذمہ داریاں
۱۱۔ مذکورہ بالا محور سے متعلق دیگر امور۔

مقالہ نگاروں کے لئے ضروری ہدایات:

۱۔ مقالہ ورڈ فائل (word) میں ٹائپ شدہ ہو اور ۱۵ سے ۲۰ صفحات پر مشتمل ہو۔
۲۔ ترجمہ شدہ مقالات کے ساتھ اصل مقالہ بھی ارسال کرنا ضروری ہے۔
۳۔ مقالے میں محقق کا نام، عہدہ، ادارے کا نام، ای میل اور موبائل نمبر مکمل طور پر لکھنا ضروری ہے۔
۴۔ مقالہ ۱۵ صفحہ سے کم اور ۲۵ صفحات سے زیادہ نہ ہو، خلاصہ اردو میں زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ الفاظ اور کلیدی الفاظ ۵ کلمات پر مشتمل ہو اور انگریزی خلاصہ بھی ساتھ ارسال کیا جائے۔
۵۔ مصادر و منابع اور حواشی سمیت پورے مقالے کو مجلے کے ضوابط کے مطابق تنظیم کیا جائے۔
۶۔ حوالہ جات اور کتابیات کو مندرجہ ذیل طریقے پر مرتب کیا جائے:

حوالہ جات :

کتاب : (پورا نام، لقب، کتاب کا نام، جلد نمبر، مترجم کا نام، محل اشاعت، ناشر، سن اشاعت، صفحہ نمبر)

مثال : مرتضی، مطہری، سیرہ نبوی، ترجمہ : سید سعید حیدر، کراچی، دارالثقلین، ۱۴۲۶ھ، ص ۹۵

مقالہ : (پورا نام، لقب، مقالے کا عنوان، مجلے کا نام، جلد نمبر، شمارہ، سال، صفحہ نمبر)

مثال : سید اسد اللہ حسینی، بررسی سب و لعن از منظر فقہ اسلامی، تعلیم و تربیت، جلد ۸، شمارہ ۲۳، ۱۴۰۱ صفحہ ۱۳۳ ۔ ۱۵۳

کتابیات :

کتاب : حروف تہجی کے مطابق (لقب، پورا نام، کتاب کا نام، محل اشاعت، ناشر، سن اشاعت)

مثال : کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، بیروت، دارالفکر، ۱۴۱۰ھ

مقالہ : حروف تہجی کے مطابق (لقب، پورا نام، مقالے کا عنوان، مجلے کا نام، جلد نمبر، شمارہ، سن اشاعت، ص نمبر)

مثال : مطہری، محمد لطیف، روایات کی روشنی میں جوان اور جوانی کی اہمیت، تعلیم و تربیت، جلد ۱۰، شمارہ ۱۳، ۱۴۰۳، صفحہ ۱۳۳ ۔ ۱۵۳

یاددہانی :

۱۔ فقہ تربیتی کے شش ماہی جریدے میں وہی مضامین شائع ہوسکتے ہیں جو علمی اور تحقیقی ہو۔

۲۔ موصولہ مقالات واپس نہیں کیے جائیں گے۔

۳۔ مسئول مجلہ مضامین میں ترمیم کر سکتا ہے۔

۴۔ مجلہ میں موجود مقالات صرف مقالہ نگاروں کا اظہار خیال ہیں۔

۵۔ مضمون کی اشاعت انجمن فقہ تربیتی کی صواب دید پر ہوگی۔

۶۔ مضامین کی ترتیب مسئول مجلہ کی رائے پر مبنی ہے۔

۷۔ مقالہ غیر مطبوعہ ہو اور کہیں اشاعت کے لیے نہ دیا گیا ہو۔

۸۔ مقالہ کلی یا جزوی طور پر توہین آمیز کلمات و مفاہیم اور علمی سرقت سے پاک ہو۔

۹۔ مجلے کے مندرجات حوالے کے ساتھ نقل کرنے میں کوئی مانع نہیں۔

۱۰۔ مجلہ ہر قسم کی تعمیری تنقید اور تجاویز کا استقبال کرتا ہے۔

سخن مدیر:

فقہ وہ علم ہے جو انسانوں کے لئے احکام اسلامی (واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام) تعیین کرتا ہے اورانسان کی زندگی کے ہر شعبے میں اس کی جسمانی اورروحانی اختیاری افعال میں عمل دخل رکھتا ہے۔اور ہر ایک مکلف افراد، گروہ اور معاشرے کی ذمہ داریوں کو مشخص کرتا ہے۔ شعبہ تعلیم و تربیت کی ضرورت حوزوی مراکز میں باقی سارے تعلیمی شعبے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ حوزہ علمیہ کا ادعا ہے کہ وہ جامعہ اور معاشرے کی اصلاح اور تعلیم و تربیت، تبلیغ دین اور اسلامی معارف کی نشر و اشاعت کا علمبر دار ہے۔ اس لئے لوگوں کی شرعی ذمہ داریوں کی تشخیص اور تعیین کو اپنا وظیفہ سمجھتا ہے۔

یہاں ہم رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیت اللہ العظمیٰ امام خامنہ ای (مدظلہ العالی) کا حوزہ علمیہ قم کے یوم تاسیس کی مناسبت سے منعقدہ سیمینار کے نام پیغام ذکر کریں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحمنِ الرَّحِیمِ وَ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعالَمِینَ وَ اَفۡضَلِ الصَّلاۃِ وَ السَّلامُ عَلَي سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ الۡمُصۡطَفَي وَ آلِہِ الطَّاھِرِینَ سِیَّمَا بَقِیَّۃَ اللّٰہِ فِی الۡعَالَمِینَ

ہولناک حوادث کے درمیان حوزہ علمیہ قم کا قیام ایک بے نظیر واقعہ تھا

چودہویں صدی ہجری شمسی کے آغاز میں قم کے مبارک حوزہ علمیہ کا قیام جو ایسے ہولناک بڑے حوادث کے درمیان منصہ شہود میں آیا کہ جنہوں نے مغربی ایشیا کی فضا تیرہ و تار اور اقوام کی زندگی آشفتہ حالی اور تباہی کے حوالے کر دی تھی۔

گزشتہ صدی سے اس علاقے میں وجود میں آنے والی سختیوں کا سبب سامراجی حکومتیں:

ان وسیع اور نہ ختم ہونے والی سختیوں کا سبب اور وجہ سامراجی حکومتوں اور پہلی جنگ عظیم کے فاتحین کی مداخلت تھی کہ جنہوں نے زیر زمین ذخائر سے مالا مال اس اہم جغرافیائی خطے پر قبضہ کرنے اور اپنا تسلط جمانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا اور فوجی طاقت، سیاسی منصوبہ بندی، رشوت، اندرونی خیانت کاروں کو خرید کر، نیز تشہیراتی و ثقافتی حربوں اور دیگر تمام ممکنہ حربوں سے کام لے کر اپنے اہداف پورے کئے۔

عراق میں انگریز حکومت اس کے بعد پٹھو بادشاہت قائم کی۔ بلاد شام میں، ایک طرف برطانیہ نے اور دوسری طرف فرانس نے اپنے زیر قبضہ علاقوں کے ایک حصے میں قبائلی نظام اور دوسرے میں برطانیہ کی تابع فرمان حکومت قائم کی اور اس پورے خطے میں، عوام بالخصوص مسلمانوں اور علمائے دین پر دباؤ اور گھٹن کی فضا چھا گئی۔ ایران میں ایک بے رحم، لالچی اور فرومایہ قزاق کو تدریجی طور پر اوپر لائے اور وزارت عظمی اور اس کے بعد بادشاہت تک پہنچا دیا۔ فلسطین میں، صیہونی عناصر کی تدریجی مہاجرت اور پھر انہیں مسلح کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور قلب عالم اسلام میں سرطانی پھوڑا وجود میں لانے کے لئے زمین ہموار کی۔ جہاں بھی، چاہے وہ عراق ہو، شام ہو، فلسطین ہو یا ایران، ان کے سازشی منصوبوں کے راستے میں کوئی مزاحمت ہوئی، اس کو کچل دیا اور بعض شہروں جیسے نجف میں علمائے کرام کی اجتماعی گرفتاری اور میرزائے نائینی، سید ابوالحسن اصفہانی اور شیخ مہدی خالصی جیسے بزرگ مراجع کرام کو توہین آمیز طریقے سے جلاوطن کیا اور مجاہدین کی گرفتاری کے لئے، گھر گھر تلاشی شروع کر دی۔ اقوام وحشت زدہ اور سرگرداں ہو گئیں اور مستقبل تاریک اور مایوس کن نظر آنے لگا اور امور کی باگ ڈور خیانت کارانہ معاہدے کرنے والوں کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

حوزہ علمیہ قم، ناسازگار زمانے کی سنگلاخ زمین میں ایک پودا: انہیں تلخ حوادث اور تاریک رات میں ستارہ قم طلوع ہوا۔ دست قدرت الہی نے ایک عظیم، پرہیزگار اور مجرّب فقیہ کو اٹھایا کہ وہ ہجرت کر کے قم آئے اور فرسودہ اور بند پڑے ہوئے حوزہ علمیہ میں دوبارہ جان ڈالی اور اس ناسازگار دور کی سنگلاخ زمین میں، روضہ دختر حضرت امام موسی کاظم (علیہ السلام) کے پاس، ایک نیا اور مبارک پودا لگایا۔

ماضی کے تجربات کی بنیاد پر آیت اللہ حائری کے ہاتھوں حوزہ علمہ قم کی تاسیس کا کارنامہ آیت اللہ حائری کی آمد کے وقت قم بزرگ علما سے خالی نہیں تھا۔ آیت اللہ میرزا محمد ارباب اور آیت اللہ شیخ ابوالقاسم کبیر جیسی عظیم ہستیاں اور دیگر علمائے کرام اس شہر میں موجود تھے لیکن حوزہ علمیہ یعنی علم، عالم اور دین و دیندار کی پرورشگاہ کی، اس کی سبھی نزاکتوں کے ساتھ، تاسیس صرف آیت اللہ حائری (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) جیسی مویّد ہستی کے ہاتھوں ہی ممکن تھی۔

اراک میں حوزہ علمیہ کی تاسیس اور طلبا سے بھرے ہوئے اس حوزہ علمیہ کو آٹھ سال تک چلانے کا تجربہ، اس سے برسوں قبل، سامرا میں میرزائے شیرازی جیسے عظیم شیعہ رہبر کے ساتھ قریبی معاشرت اور اس شہر میں حوزہ علمیہ کی تاسیس نیز اس کو چلانے کی تدابیر کا مشاہدہ، ان کی رہنمائی کر رہا تھا، اور ان کے اندر موجود درایت، شجاعت، جذبہ اور امید انہیں اس راہ میں آگے بڑھا رہی تھی۔

حوزہ علمیہ کی شہرت اور ترقی نیز آیت اللہ حائری کی پائیداری اور توکل :

حوزہ علمیہ اپنے ابتدائی برسوں میں، خدا پر ان کے (آیت اللہ حائری کے) توکل اور مخلصانہ پائیداری کے نتیجے میں، رضا خانی شمشیر سے جو دین کی نشانیوں اور ستونوں کو مٹانے میں چھوٹے بڑے کسی پر بھی رحم نہیں کرتی تھی، محفوظ نکل گیا۔ خبیث ستمگر مٹ گیا اور وہ حوزہ علمیہ جو برسوں شدید ترین دباؤ میں رہا، باقی رہا اور اس نے ترقی کی اور اس سے حضرت روح اللہ جیسا خورشید طلوع ہوا۔ وہ حوزہ علمیہ کہ کسی زمانے میں اس کے طلبا اپنی جان بچانے کے لئے، صبح سے ہی، مختلف طریقوں سے شہر سے باہر پناہ لیا کرتے تھے، وہاں درس و مباحثہ کیا کرتے تھے اور رات کی تاریکی میں، مدرسوں کے حجروں میں واپس آیا کرتے تھے، اس کے بعد چار عشروں کے دوران ایسے مرکز میں تبدیل ہو گیا کہ جو، پورے ملک میں نا امیدی میں مبتلا اور افسردہ دلوں میں رضا خان کی خبیث نسل کے خلاف مجاہدت کے شعلے بھڑکا رہا تھا اور گوشہ نشین نوجوانوں کو میدان میں لا رہا تھا۔

حوزہ علمیہ کی جاویدانی برکات:

اور یہی حوزہ علمیہ تھا کہ جو اپنے بانی کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد، مرجع عظیم الشان، آیت اللہ بروجردی کے قدموں کی برکت سے پوری دنیا میں تشیع کی تبلیغی، تحقیقاتی اور علمی چوٹی میں تبدیل ہوگیا اور یہی حوزہ علمیہ تھا کہ جس نے چھے عشرے سے کم مدت میں اپنی روحانی طاقت اور عوامی پہلو کو اس منزل تک پہنچا دیا کہ عوام کے ہاتھوں خائن، بدعنوان اور فاسق بادشاہت کو اکھاڑ پھینکا اور صدیوں کے بعد ایک بڑے متمدن اور ہر طرح کی صلاحیتوں کے مالک عظیم ملک میں اسلام کو اس کی سیاسی حکمرانی کی جگہ پر پہنچا دیا۔

اسی بابرکت حوزہ علمیہ سے اٹھنے والی ہستی تھی کہ جس نے ایران کو عالم اسلام میں اسلام پسندی کا مثالی نمونہ، بلکہ پوری دنیا میں دینداری کا پیش قدم ملک بنا دیا۔ اس کے پیغمبرانہ خطاب سے شمشیر پر خون کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کی تدبیر سے اسلامی جمہوریہ وجود میں آئی۔ اس کی شجاعت اور توکل سے ملت ایران خطرات کے مقابلے میں سینہ سپر اور اس گروہ کثیر پر غالب آئی اور آج اسی ہستی کے دیے ہوئے درس اور ورثے کے نتیجے میں ملک زندگی کے سبھی میدانوں میں رکاوٹیں ہٹا کر آگے بڑھ رہا ہے۔ اس بابرکت و باعظمت حوزہ علمیہ اور پر ثمر شجرہ طیبہ کے بانی، بلند مرتبہ، دانا اور مبارک انسان، عالم دین اور اس سکون سے آراستہ ہستی جو یقین سے حاصل ہوتا ہے، آیت اللہ العظمی حاج شیخ عبدالکریم حائری پر رحمت و رضوان الٰہی قائم و دائم رہے۔

پیش قدم اور نمایاں حوزہ علمیہ کا سفر:

اب ضروری ہے کہ ان چند موضوعات کے بارے میں جن کے لئے خیال کیا جاتا ہے کہ حوزہ علمیہ کے حال اور مستقبل کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں، کچھ بات کی جائے۔ امید ہے کہ اس سے موجودہ کامیاب حوزہ علمیہ کے پیش قدم اور نمایاں حوزہ علمیہ کی منزل تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔

ماضی کے تجربات کی بنیاد پر آیت اللہ حائری کے ہاتھوں حوزہ علمہ قم کی تاسیس کا کارنامہ:

آیت اللہ حائری کی آمد کے وقت قم بزرگ علما سے خالی نہیں تھا۔ آیت اللہ میرزا محمد ارباب اور آیت اللہ شیخ ابوالقاسم کبیر جیسی عظیم ہستیاں اور دیگر علمائے کرام اس شہر میں موجود تھے لیکن حوزہ علمیہ یعنی علم، عالم اور دین و دیندار کی پرورشگاہ کی، اس کی سبھی نزاکتوں کے ساتھ، تاسیس صرف آیت اللہ حائری (اعلی اللہ مقامہ فی الجنان) جیسی مویّد ہستی کے ہاتھوں ہی ممکن تھی۔

اراک میں حوزہ علمیہ کی تاسیس اور طلبا سے بھرے ہوئے اس حوزہ علمیہ کو آٹھ سال تک چلانے کا تجربہ، اس سے برسوں قبل، سامرا میں میرزائے شیرازی جیسے عظیم شیعہ رہبر کے ساتھ قریبی معاشرت اور اس شہر میں حوزہ علمیہ کی تاسیس نیز اس کو چلانے کی تدابیر کا مشاہدہ، ان کی رہنمائی کر رہا تھا، اور ان کے اندر موجود درایت، شجاعت، جذبہ اور امید انہیں اس راہ میں آگے بڑھا رہی تھی۔

حوزہ علمیہ کی شہرت اور ترقی نیز آیت اللہ حائری کی پائیداری اور توکل:

حوزہ علمیہ اپنے ابتدائی برسوں میں، خدا پر ان کے (آیت اللہ حائری کے) توکل اور مخلصانہ پائیداری کے نتیجے میں، رضا خانی شمشیر سے جو دین کی نشانیوں اور ستونوں کو مٹانے میں چھوٹے بڑے کسی پر بھی رحم نہیں کرتی تھی، محفوظ نکل گیا۔ خبیث ستمگر مٹ گیا اور وہ حوزہ علمیہ جو برسوں شدید ترین دباؤ میں رہا، باقی رہا اور اس نے ترقی کی اور اس سے حضرت روح اللہ جیسا خورشید طلوع ہوا۔ وہ حوزہ علمیہ کہ کسی زمانے میں اس کے طلبا اپنی جان بچانے کے لئے، صبح سے ہی، مختلف طریقوں سے شہر سے باہر پناہ لیا کرتے تھے، وہاں درس و مباحثہ کیا کرتے تھے اور رات کی تاریکی میں، مدرسوں کے حجروں میں واپس آیا کرتے تھے، اس کے بعد چار عشروں کے دوران ایسے مرکز میں تبدیل ہو گیا کہ جو، پورے ملک میں نا امیدی میں مبتلا اور افسردہ دلوں میں رضا خان کی خبیث نسل کے خلاف مجاہدت کے شعلے بھڑکا رہا تھا اور گوشہ نشین نوجوانوں کو میدان میں لا رہا تھا۔

حوزہ علمیہ کو تشکیل دینے والے عناصر اور اس کی کارکردگی:

پہلا موضوع حوزہ علمیہ کا عنوان اور اس کا گہرا مفہوم ہے، اس سلسلے میں رائج تعریف ناقص اور غیر واضح ہے۔ اس تعریف کے برخلاف حوزہ علمیہ صرف پڑھنے اور پڑھانے کا ادارہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں علم، تربیت اور سیاسی و سماجی کارکردگی سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ معنی و مفاہیم سے مملو اس اصطلاح کو بالترتیب اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے

۱۔ معینہ تخصص (اسپیشلائزیشن) کا حامل ایک علمی مرکز۔

۲۔ معاشرے کی دینی اور اخلاقی ہدایت کے لئے پاکیزگی نفس کی مالک کارآمد افرادی قوت کی تربیت کا مرکز۔

۳۔ مختلف میدانوں میں دشمنوں کے خطرات کا مقابلہ کرنے والے محاذ کی اگلی صف

٤۔ سیاسی نظام، اس ڈھانچے اور مندرجات سے لے کر امور مملکت چلانے کے نظام اور ذاتی روابط اور خاندانی نظام تک پر مشتمل، سبھی سماجی اور اجتماعی نظاموں کے بارے میں فقہ، فلسفے اور اسلامی اقدار کی اساس پر اسلامی افکار کی تخلیق اور بیان کا مرکز۔

۵۔ اسلام کے عالمی پیغام کے دائرے میں لازمی دور اندیشی اور تہذیب و تمدن کے نئے گوشوں کی ایجاد اور فروغ کا مرکز۔

یہ وہ عناوین ہیں کہ جن کے ذریعے حوزہ علمیہ کی اصطلاح کی تعریف کی جا سکتی ہے اور اس کو تشکیل دینے والے عناصر اور دوسرے لفظوں میں، اس سے وابستہ "توقعات" کی نشاندہی کی جا سکتی ہے اور یہی وہ عناصر ہیں کہ جن کی تقویت اور فروغ کی کوشش حوزہ علمیہ کو حقیقی معنی میں "پیش قدم اور نمایاں" بنا سکتی ہے اور درپیش چیلنجوں نیز ممکنہ خطرات کو برطرف کر سکتی ہے۔

حوزہ علمیہ، مختلف علوم میں علمائے دین کے سرمایہ کا وارث:
ان تمام عناوین کے بارے میں حقائق اور نظریات پائے جاتے ہیں جنہیں اجمالی طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

اول- علمی مرکز:
حوزہ علمیہ قم، عظیم شیعہ علمی سرمایہ کا وارث ہے۔ یہ سرمایہ اپنی نوعیت میں بے نظیر اور فقہ و کلام اور فلسفہ، تفسیر نیز حدیث جیسے علوم میں ہزاروں علمائے دین کی ایک ہزار سالہ فکری و تحقیقاتی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ حالیہ صدیوں میں نیچرل سائنسز کے انکشاف سے پہلے تک، شیعہ حوزہ علمیہ میں دیگر علوم پر بھی کام ہوتا تھا، لیکن سبھی ادوار میں حوزہ ہائے علمیہ میں بحث اور تحقیق کا اصلی موضوع فقہ اور اس کے بعد کلام، فلسفہ اور حدیث کا ہوا کرتا تھا۔
اس طولانی دور میں، شیخ طوسی سے لے کر محقق حلی تک اور ان سے لے کر شہید اول تک اور ان کے دور سے لے کر محقق اردبیلی تک اور ان سے شیخ انصاری نیز موجودہ دور تک علم فقہ کی تدریجی پیشرفت نمایاں رہی ہے۔ فقہ کی پیشرفت میں معیار، قابل فخر علمی ذخائر میں اضافہ، علمی سطح کی بلندی اور جدید تحقیقات رہی ہیں. لیکن آج معاصر ادوار بالخصوص حالیہ صدی میں تیز رفتار علمی و فکری تغیرات کے پیش نظر، حوزہ علمیہ میں علمی پیشرفت پر اس سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

فقہ۔ معنی اور کارکردگی
پہلی چیز یہ کہ فقہ، درحقیقت دین کا عملی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کے جواب دینے کا نام ہے۔ لیکن جب سے عقلی سوچ نے ترقی کی ہے اور نسلوں کا فکری ارتقاء ہوا ہے، اب ان جوابات کا مضبوط علمی اور فکری بنیادوں پر استوار ہونا نہایت ضروری ہے، ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ جوابات عام فہم اور قابل قبول ہوں۔
دوسری بات یہ ہے یہ جو آج لوگوں کی زندگی میں بے شمار پیچیدہ واقعات اور سوالات سامنے آتے ہیں، فقہ معاصر کو ان سب کا جواب دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل کے بعد اصلی سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں نیز ان کے بنیادی اصولوں کے بارے میں شارع کا عظیم نقطہ نگاہ کیا ہے۔ انسان، انسانی حیثیت، اس کی زندگی کے اہداف سے لے کر، انسانی معاشرے کی مطلوبہ شکل، سیاست، اقتدار، سماجی وخاندانی روابط، جنسی امور، عدل وانصاف اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کے بارے میں اس کا جامع نظریہ کیا ہے۔ ہر مسئلے میں فقیہ کے فتوے کو اسی بڑے نظریے کا عکاس ہونا چاہیئے۔

انسانی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں اور ضروریات کے حوالے سے فقہ کی لازمی جواب دہی ان خصوصیات کے لئے ضروری ہے کہ فقیہ دینی علوم اور ان کے سبھی پہلوؤں سے واقف ہو، دوسرے اس کو علوم انسانی اور ان دیگر تمام علوم سے بھی واقف ہونا چاہیئے جو انسان کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ حوزہ علمیہ کے علمی ذخائر میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ طلبہ کو علمی توانائیوں کی اس سطح تک پہنچا سکے مگر شرط یہ ہے کہ موجودہ طریقہ کار میں بعض نکات کی کھلی آنکھوں اور توانا ہاتھوں سے اصلاح کی جائے۔

ایک نکتہ تعلیمی دورانیہ کا طولانی ہونا ہے۔ طلبہ کے متون پڑھنے کا دورانیہ، اس طرح گزرتا ہے کہ بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ طالب علم کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ ایک بڑے عالم دین کی ضخیم تحقیقی کتاب کو نصاب کی کتاب کے عنوان سے پڑھے۔ یہ کتاب درحقیقت اجتہادی تحقیق کے مرحلے میں داخل ہونے کے وقت سے تعلق رکھتی ہے اور اس مرحلے سے پہلے اس کو ختم کرنے کا اثر صرف یہ ہوتا ہے کہ متن پڑھنے کا دورانیہ طولانی ہوجاتا ہے۔ نصاب کی کتاب مرحلہ تحقیق میں پہنچنے سے پہلے کے محدود دورانیہ میں طلبہ کے لئے مناسب زبان میں بیان کئے گئے، مطالب پر مشتمل ہونی چاہیئے۔

قوانین، رسائل، فصول، کفایہ دررالفوائد اور خلاصۃ الفصول، جیسی کتابوں کو تبدیل کرنے کے لئے، آخوند خراسانی، حاج شیخ عبدالکریم حائری اور حاج سید صدرالدین صدر جیسے بزرگوں کی کامیاب یا نتیجے تک نہ پہنچنے والی کوششیں، اسی ضرورت کے تحت اہم تھیں۔ اگرچہ جس دور میں وہ زندگی گزار رہے تھے، اس میں طلبہ پر آج کی طرح، اتنے زیادہ ذہنی اور علمی کاموں کا بوجھ نہیں تھا۔

ایک اور نکتہ فقہی ترجیحات کا مسئلہ ہے۔ آج اسلامی نظام کی تشکیل اور اسلامی طریقے سے حکمرانی کا مسئلہ اٹھنے کے بعد، فقہ کی ترجیحات میں ایسے موضوعات داخل ہو گئے ہیں جو ماضی میں نہیں تھے۔ جیسے عوام سے اور دیگر اقوام اور حکومتوں سے حکومت کے روابط کا مسئلہ ہے، نفی راہ کا موضوع ہے، اقتصادی نظام اور اس کے بنیادی اصولوں کا مسئلہ ہے، اسلامی نظام کے بنیادی ستون، اسلامی نقطہ نگاہ سے حکمرانی کا سرچشمہ، اس میں عوام کا کردار، اہم امور اور تسلط پسند نظام کے مقابلے میں موقف، عدل و انصاف کا مفہوم اور دسیوں دیگر بنیادی اور حیاتی اہمیت کے موضوعات ہیں جو ملک کے حال اور مستقبل کے لئے ترجیح رکھتے ہیں اور ان کے فقہی جواب کی ضرورت ہے۔ (ان میں سے بعض کلامی پہلو کے حامل بھی ہیں جن پر اپنے طور پر بحث ہونی چاہیئے۔)

حوزہ علمیہ کے موجودہ طریقہ کار میں فقہی شعبے میں ان ترجیحات پر زیادہ توجہ نظر نہیں آتی۔ یہ نظر آتا ہے کہ بعض علمی مہارتیں، جو عام طور پر حکم شرع تک پہنچنے کے تمہیدی پہلو کی حامل ہوتی ہیں یا بعض فقہ اور اصول فقہ کے موضوعات، ترجیحات سے ہٹ کر، اپنی دلکشی کے باعث فقیہ اور محقق کو اس طرح خود میں جذب کر لیتے ہیں کہ اس کے ذہن کو ان بنیادی اور ترجیح رکھنے والے مسائل سے منصرف کر دیتے ہیں اور ایسے مواقع جو پھر ہاتھ آنے والے نہیں ہوتے، اور انسانی و مالی سرمائے کو صرف کر دیتے ہیں، بغیر اس کے کہ ہجوم کفر کی نفسا نفسی کے عالم میں، اسلامی طرز زندگی کی تشریح اور معاشرے کی ہدایت میں اس سے کوئی مدد ملتی ہو۔

اگر علمی کام کا مقصد اظہار فضل اور علمی شہرت نیز فاضل نما بننے کی رقابت ہو تو وہ دنیا پرستی اور مادی فعل کا مصداق ہے اور (مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ)[1] کا اطلاق ہو جائے گا۔

۱۔ سورہ فرقان آیت نمبر ۴۳

تبلیغ کے لئے اپنی ضروریات پر حوزہ علمیہ کی توجہ:

دوم: پاکیزگی نفس کی مالک کارآمد افرادی قوت کی تربیت

حوزہ علمیہ ایسا ادارہ ہے جس کی نگاہیں بیرونی دنیا پر ہوتی ہیں۔ حوزہ علمیہ کے کام ہر سطح پر، انسانوں اور معاشرے کی فکر و ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں۔ حوزہ علمیہ پر بلاغ مبین کی ذمہ داری ہے۔ اس بلاغ کا دائرہ بہت وسیع ہے جو اعلی توحیدی علوم سے لے کر ذاتی اور انفرادی شرعی ذمہ داریوں تک پر محیط ہے۔ نظام اسلام، اس کے خد وخال اور فرائض سے لے کر، طرز زندگی، ماحول حیات اور فطرت، حیوانات نیز حیات بشری کے دیگر بہت سے شعبوں اور پہلوؤں تک، سب کا احاطہ کرتا ہے۔ حوزہ ہائے علمیہ نے ہمیشہ اپنے یہ سنگین فرائض ادا کئے ہیں اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے بہت سے لوگ مختلف علمی سطح پر، تبلیغ دین کے گوناگوں راستوں پر چلے اور اسی راہ میں عمر گزار دی۔ انقلاب کے بعد حوزہ علمیہ میں اس تبلیغی تحریک کو زیادہ محکم اور منظم کرنے کی غرض سے بعض ادارے قائم ہوئے۔ تبلیغ دین میں ان کی اہم خدمات اور اس پیشے (تبلیغ) سے وابستہ دیگر افراد کی خدمات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

جو چیز اہم ہے، وہ معاشرے کی ثقافت اور فکری ماحول سے واقفیت اور عوام بالخصوص نوجوانوں کے درمیان، فکری اور ثقافتی حقائق سے تبلیغی امور میں مطابقت لانا ہے۔ اس شعبے میں، حوزہ علمیہ مشکل سے دوچار ہے۔ یہ سیکڑوں مقالات اور جرائد، مجالس اور اجتماعات میں کی جانے والی تقاریر اور ٹیلیویژن پر کی جانے والی گفتگو وغیرہ، ذہنوں میں پیدا کئے جانے والے مغالطوں کے سیلاب کے مقابلے میں بلاغ مبین کے فریضے کو شایان شان طریقے سے ادا نہیں کر سکتے۔

تبلیغ کے لئے دو ضروری عناصر:

۱۔ تعلیم: اس شعبے کے لئے حوزہ علمیہ میں دو کلیدی عناصر کی ضرورت ہے۔ "تعلیم" اور "نفس کی پاکیزگی"۔

اس پیغام کو پہنچانے کے لئے جو وقت کے مطابق ہو، خلا کو پر کرے اور دین کے ہدف کو پورا کرے، تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ کوئی ادارہ ہونا چاہیئے جو یہ کام سنبھالے، طلبہ میں مطمئن کرنے کی صلاحیت پیدا کرے، انہیں طریقہ گفتگو اور عوام سے ارتباط نیز ابلاغیاتی وسائل اور سوشل میڈیا سے
استفادہ کا سلیقہ اور مخالفین سے پیش آنے کے اصول و ضوابط سکھائے اور ایک محدود دورانیے میں انہیں اس کی مشق کرائے اور اس میدان میں اترنے کے لئے تیار کرے۔ دوسری طرف، جدید تکنیکی وسائل سے کام لے کر ذہنوں میں پیدا کی جانے والی جدید ترین اور رائج ترین باتوں اور فکری و اخلاقی انحرافات سے واقفیت کے ساتھ وقت اور زمانے کی مناسبت سے، ان کا بہترین اور قوی ترین جواب فراہم کرے اور اسی کے ساتھ نوجوان نسل اور خاندانوں کی سوچ اور ثقافت کے تناسب سے ضروری ترین دینی معلومات کا ایک پیکج تیار کرے۔ یہ اس شعبے میں تعلیم کا اہم ترین موضوع ہے۔

ثقافتی مجاہدین کی تربیت: تبلیغ کے کام میں مثبت اور حتی کہ جارحانہ طریقہ دفاعی موقف سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ذہنوں میں ڈالی جانے والی باتوں اور شبہات کو دور کرنے کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے وہ تبلیغی ادارے کو دنیا اور شاید ہمارے اپنے ملک میں رائج انحرافی ثقافت کے مسلمات پر حملے کی طرف سے غافل نہ کر دے۔ رائج اور مسلط کی گئی مغربی ثقافت روزافزوں سرعت کے ساتھ کجروی اور انحطاط کی طرف جا رہی ہے۔ فلاسفروں اور متکلمین کا حلقہ شبہات کے دفاع پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس گمراہی اور کجروی پر فکری مسائل اٹھاتا ہے اور گمراہ کرنے والوں کو جواب دہی پر مجبور کرتا ہے۔

اس تربیتی ادارے کی تشکیل حوزہ علمیہ کی ترجیحات میں ہے۔ یہ ثقافتی مجاہدین کی تربیت کا معاملہ ہے. دشمنان دین کے اقدامات کے پیش نظر جو اپنی قوتیں آمادہ کرنے میں پوری تندہی کے ساتھ مصروف ہیں، مناسب ہے کہ اس کام کو سنجیدگی اور تیز رفتاری کے ساتھ انجام دیا جائے۔

۲۔ تزکیہ: تزکیہ یعنی نفس کی پاکیزگی بھی تعلیم کے ساتھ ضروری ہے۔ تزکیہ کا مطلب گوشہ نشین بنانا نہیں ہے۔ ثقافتی مجاہد کی وسیع سرگرمیوں کا اہم حصہ تہذیب نفس اور اخلاق اسلامی کی دعوت پر مشتمل ہے اور اگر دعوت دینے والا خود ان سے عاری ہو تو اس کا کام بے برکت اور بے اثر ہوگا۔ اخلاقی سفارشات کی تاکید کے حوالے سے حوزہ علمیہ کو ماضی سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اخلاص اور سختیوں کا تحمل عزم وارادے کے استحکام کا عامل: آپ نوجوان طلاب اور افاضل آلودگی سے پاک دل اور سچی زبان کی مدد سے آج کی نوجوان نسل کی تہذیب اخلاق کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کام کا آغاز اپنی ذات سے کریں۔ عمل میں اخلاص اور دولت، نام و نمود اور مقام ومرتبے کے وسوسے کا راستہ بند کر دینا، معنویت وحقیقت کی دلنواز فضا میں قدم رکھنے کی کلید ہے اور اس صورت میں ثقافتی مجاہدت کا سخت کام ایک موثر اقدام اور شیریں فریضے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس صورت میں طالب علمی کے دور کی سختیاں، تبلیغ کے مجاہدانہ طرز عمل میں رکاوٹ بننے کے بجائے، ارادہ محکم اور عزم راسخ کے وسیلے میں تبدیل ہو جائیں گی۔ میری تاکید ہے کہ تبلیغ کے میدان کو رقیب سے خالی میدان ہرگز نہ سمجھا جائے اور ان شبہات اور مغالطوں کو جو پے در پے پیدا کئے جاتے ہیں، دور کرنے کی طرف سے ایک لمحے کی بھی غفلت نہیں ہونی چاہیئے۔

اس حصے میں، بلاغ مبین کے لئے افرادی قوت کی تربیت کے ساتھ نظام اور امور مملکت چلانے میں خاص فرائض کے لئے بھی افرادی قوت کی تیاری اور اسی طرح خود حوزہ علمیہ کے اندر نظم و ضبط اور فرائض کی انجام دہی پر بھی توجہ دی جائے جس کے لئے علیحدہ بحث کی ضرروت ہے۔

حالیہ صدیوں میں اصلاحی تحریکوں کی قیادت حوزہ علمیہ کا مزاج:

۳۔ مختلف میدانوں میں دشمن کے خطرات کے مقابلے کا اگلا محاذ:

یہ حوزہ علمیہ اور علمائے دین کی کارکردگی کا ناشناختہ ترین پہلو ہے۔ حالیہ ڈیڑھ سو برس میں ایران اور عراق میں کوئی بھی اصلاحی اور انقلابی تحریک ایسی نہیں ملے گی جس کی قیادت علمائے دین نے نہ کی ہو یا وہ آگے آگے نہ رہے ہوں۔ یہ حوزہ علمیہ کی ماہیت کی اہم نشانی ہے۔

اس پورے دور میں استعمار اور استبداد کی تسلط پسندی کے سبھی معاملات میں صرف علمائے دین تھے جو سب سے پہلے میدان میں آئے اور بہت سے معاملات میں عوام کی حمایت کی برکت سے دشمن کو ناکامی سے دوچار کیا۔ ان کے علاوہ اور کسی میں بھی دم مارنے کی بھی جرئت نہیں تھی یا کوئی اور مسئلے کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پا رہا تھا اور علمائے کرام کی آواز بلند ہونے کے بعد دوسرے بھی آواز بلند کرتے تھے۔ کسروی جو علمائے دین کے سخت ترین دشمنوں میں شمار ہوتا ہے، اعتراف کرتا ہے کہ آئینی حکومت کی تحریک دو ہستیوں، سید بہبہانی اور سید طباطبائی کی دانشمندانہ ہمراہی سے وجود میں آئی۔ جی ہاں! ان دنوں استبداد جھنڈے گاڑ چکا تھا۔ ان حالات میں علما و مراجع کرام کے علاوہ کسی میں بھی دم مارنے کی جرائت نہیں تھی۔

اس دور میں، شرمناک معاہدے علمائے کرام کی مخالفت اور ممانعت کی وجہ سے ختم ہوئے۔ رویٹر معاہدہ، تہران کے بڑے عالم دین، الحاج ملا علی کنی اور تنباکو کا معاہدہ مرجع اعلی میرزائے شیرازی کے فتوے نیز ایران کے بزرگ علمائے دین کی جانب سے اس فتوے کی حمایت کے نتیجے میں ختم ہوا۔ وثوق الدولہ معاہدہ، مدرس کی جانب سے بے نقاب کئے جانے پر ختم ہوا اور غیر ملکی کپڑوں کے خلاف تحریک آقا نجفی اصفہانی نے شروع کی اور علمائے اصفہان نے ان کا ساتھ دیا اور علمائے نجف نے حمایت کی اور دیگر معاملات بھی اسی طرح۔

حوزہ علمیہ قم کی تاسیس سے ملحقہ برسوں میں عراق کے کچھ حصے اور ایران کے سرحدی علاقے نجف اور کربلا کی مرکزیت کے ساتھ، غاصب انگریزوں کے خلاف علمائے کرام کی مسلحانہ جنگ کا میدان بن گئے تھے۔ صرف طلاب اور مدرسین ہی نہیں بلکہ بعض مشہور علما جیسے سید مصطفی کاشانی اور بعض مراجع کرام کے بیٹے بھی اس لڑائی میں شریک تھے۔ ان میں سے کچھ شہید ہوئے اور بہت سے، دور دراز کی برطانوی نوآبادیات میں جلاوطن کر دیے گئے۔ فلسطین کے مسئلے میں بھی اس صدی کے اوائل میں بھی جس میں صیہونیوں کو لاکے سرزمین فلسطین میں بسایا جارہا تھا اور انہیں مسلح کیا جارہا تھا اور اس کے تیسرے عشرے میں بھی کہ جب فلسطین کا بڑا حصہ باضابطہ صیہونیوں کے حوالے کر دیا گیا اور جعلی صیہونی حکومت کا اعلان کیا گیا، مراجع کرام کی فعالیت، حوزہ ہائے علمیہ کے قابل فخر کارناموں میں ہے۔ اس بارے میں ان کے خطوط اور بیانات، اہم ترین تاریخی دستاویزات شمار ہوتے ہیں۔

اسلامی تحریک شروع کرنے اور انقلاب بپا کرنے نیز رائے عامہ کو سمجھانے اور عوام الناس کو میدان میں لانے میں بھی حوزہ علمیہ قم اور اس کے بعد ایران کے دیگر حوزہ ہائے علمیہ کا بے نظیر کردار، حوزہ ہائے علمیہ کے جہادی تشخص کی نشانی ہے۔ حوزہ علمیہ کے فارغ التحصیل حضرات، اپنے فعال ذہن اور زبان گویا کے ساتھ ان پہلے لوگوں میں تھے جنھوں نے امام مجاہد کی دشمن شکن فریاد پر لبیک کہا اور بہت تیزی اور سنجیدگی کے ساتھ اور سختیاں برداشت کرکے، میدان میں آئے اور انقلابی مفاہیم کی تبلیغ نیز رائے عامہ کو ہموار کرنے کا کام شروع کیا۔

منشور علما کے نام سے علمائے کرام کے نام پیغام میں امام رحمت اللہ علیہ کے خدشات اور امیدیں ان حقائق سے آگاہی کے ساتھ امام رضوان اللہ علیہ نے حوزہ

ہائے علمیہ کے نام اپنے اہم پیغام[۱] میں علمائے کرام کو سبھی عوامی اور اسلامی انقلابات کے سر فہرست کے شہدا میں شمار کیا اور اسی طرح کے شہیدوں کی راہ اور کام فقہ کے امور کی حقیقت تک پہنچنا قرار دیا۔ دوسرے لفظوں میں آپ نے علما کو میدان جہاد اور وطن نیز مظلومین کی حمایت کا پیشرو قرار دیا۔ آپ نے حوزہ علمیہ کے مستقبل کے حوالے سے طلاب اور افاضل سے زیادہ امیدیں وابستہ کی ہیں کہ جن کے اندر تحریک، مجاہدت اور انقلاب کی فکر نے جوش و ولولہ پیدا کیا اور جو لوگ ان حیاتی اہمیت کے مسائل سے دور رہتے ہوئے، صرف کتاب اور درس پر اکتفا کر رہے تھے ان سے گلہ مندی ظاہر کی ہے۔ اس پیغام میں بارہا، تحجّر میں مبتلا لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دشمن کے ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانے کی جانب سے خبردار کیا گیا ہے اور دین فروشی کے تغیر یافتہ طریقوں کی طرف سے خطرے کا اعلان کیا گیا ہے۔ امام عظیم کی صائب رائے کے مطابق پوری دنیا میں سامراجی شکارچی، سیاست سے واقف شیر دل علمائے کرام کی گھات میں بیٹھے ہیں اور علمائے کرام کے عوامی اثر و رسوخ نیز ان کی عظمت و بزرگی کے خلاف جنگ کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔

تحجّر اور سیاست میں عدم مداخلت کی بابت تشویش:

اس دانشمندانہ متن میں جو عرفان اور عاشقانہ جذبات کے ساتھ لکھا گیا ہے، امام کے قلب کی یہ بے چینی ہویدا ہے کہ تحجّر اور تقدس مآبی کی روش کہیں حوزہ ہائے علمیہ میں یہ وسوسہ نہ پیدا کر دے کہ دین سیاست سے الگ ہے، اور پھر سماجی سرگرمیوں نیز پیشرفت کا صحیح راستہ بند کر دے۔ یہ فکر مندی اس خطرناک تحریک کی ترویج کا نتیجہ ہے جس میں لوگوں کے بنیادی مسائل اور حوزہ علمیہ کی مداخلت اور اس کے سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں شامل ہونے نیز ظلم و بدعنوانی کے خلاف مجاہدت کو دین اور معنوی

۱۔ صحیفہ امام، ج ۲۱ ص ۲۷۳، علما، مراجع، مدرسین، طلاب اور ائمہ جمعہ جماعات کے نام پیغام ۱۴-۳-۱۹۸۸

حدود کے تقدس کے منافی ظاہر کیا جاتا ہے اور علمائے کرام سے صلح کل بننے اور سیاست میں قدم رکھنے کے خطرات سے دوری کی سفارش کی جاتی ہے۔

اس باطل توہّم کی ترویج سامراج اور استکبار کے عوامل کے لئے سب سے بڑا تحفہ ہے کہ جنہیں ہمیشہ ان کے خلاف جدوجہد کے معرکے میں علمائے کرام کی موجودگی سے نقصان پہنچا ہے اور متعدد مواقع پر شکست ہوئی ہے اور فاسق، پٹھو اور بدعنوان نظام کے عوامل کے لئے بھی سب سے بڑا تحفہ ہے جو ایک مرجع تقلید کی قیادت میں ملت ایران کی تحریک سے جڑ سے اکھڑ گیا اور ختم ہو گیا۔

دین کا تقدس، ہر جگہ سے زیادہ، فکری، سیاسی اور فوجی جہاد کے میدانوں میں ظاہر ہوتا ہے اور حاملین علوم دین کے جہاد و فداکاری اور ان کے پاکیزہ خون سے مستحکم ہوتا ہے۔ دین کا تقدس پیغمبر اعظم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی سیرت میں دیکھنا چاہیئے کہ یثرب پہنچنے کے بعد آپ کا پہلا اقدام مسجد میں، حکومت کی تشکیل، فوجی قوت کی تنظیم اور عبادت و سیاست میں یک جہتی پیدا کرنا تھا۔

حوزہ علمیہ کو اپنے معنوی اعتبار اور فلسفہ وجودی سے وفاداری کے لئے عوام، معاشرے اور اس کے بنیادی مسائل سے ہرگز الگ نہیں ہونا چاہیئے اور ضرورت پڑنے پر جہاد کی ہر قسم کو اپنا یقینی فریضہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ وہی اہم بات ہے جو امام بزرگوار نے حوزہ علمیہ، اس کے عمائدین، بزرگوں اور بالخصوص نوجوان طلاب و افاضل سے بارہا کہی ہے اور اس کی تاکید کی ہے۔

۴۔ سماجی نظاموں کی تشکیل اور بیان میں مشارکت کا مرکز:

اسلام کی بنیاد پر سماجی نظاموں کی تشکیل اور وضاحت: ممالک اور انسانی معاشرے اپنی سبھی اجتماعی حیثیتوں میں معینہ نظاموں کے تحت چلائے جاتے ہیں۔ حکومت کی شکل اور طریقہ حکمرانی (استبداد، مشورت وغیرہ) عدالتی سسٹم اور تنازعات، خلاف ورزیوں، نیز قانونی و تعزیراتی معاملات میں فیصلے کا نظام اقتصادی،

مالی اور کرنسی کا سسٹم، دفتری نظام، کام کاج اور خاندان اور دیگر بہت سے امور کے نظام، یہ سبھی ملک کی سماجی حیثیتوں میں شامل ہیں اور عالمی معاشروں میں ان کے امور گوناگوں طریقوں اور مختلف نظاموں کے تحت چلائے جاتے ہیں۔ بیشک ان میں سے ہر نظام فکری بنیادوں پر قائم ہوتا ہے چاہے مفکرین اور صاحب الرائے حضرات کے ذہن کی پیداوار ہو یا مقامی رسم و رواج اور روایات کی دین اور موروثی ہو۔ اسلامی حکومت میں یہ بنا اور قاعدہ فطری طور پر اسلام اور اس کے معتبر متون کے مطابق اور معاشرہ چلانے کے نظاموں کو بھی انہیں سے ماخوذ ہونا چاہیئے۔

فقہ شیعہ میں اگرچہ، بعض معاملات جیسے عدالت کے باب کو چھوڑ کر، ان امور پر کافی توجہ نہیں دی گئی، لیکن کتاب و سنت سے فقہی امور اخذ کرنے کے وسیع قواعد کی برکت اور ثانوی عناوین کی مدد سے اس کے اندر معاشرہ چلانے کے گوناگوں نظام تیار کرنے کی ضروری صلاحیت موجود ہے۔

نجف اشرف میں جلاوطنی کے زمانے میں، ولایت فقیہ کے مباحث میں، امام رحمت اللہ علیہ کا ممتاز کام حکومت کی بنیاد اور اصول کے باب میں ایک مبارک آغاز تھا جس نے حوزہ علمیہ سے تعلق رکھنے والے افاضل کے سامنے تحقیق کا راستہ کھولا اور اسلامی جمہوریہ کی تشکیل کے بعد، اس کے گوناگوں پہلوؤں کی نظری اور عملی تکمیل ہوئی۔ لیکن یہ کام ملک کے بہت سے اجتماعی نظاموں کی طرح نامکمل اور بے سروسامانی کی حالت میں باقی رہ گیا۔ یہ خلا حوزہ علمیہ کو پر کرنا چاہیئے۔

یہ حوزہ علمیہ کے حتمی فرائض میں شامل ہے۔ آج اسلامی نظام اور حکمرانی کے قیام سے فقیہ اور فقاہت کا فریضہ سنگین ہو گیا ہے۔

آج جیسا کہ امام (رحمت اللہ علیہ) نے فرمایا ہے، نادانوں کی طرح انفرادی اور عبادتی احکام میں غرق ہو جانے کو فقاہت نہیں سمجھا جا سکتا۔ امت کی تشکیل کرنے والی فقہ انفرادی فرائض اور عبادتی احکام تک محدود نہیں ہے۔

دنیا کی نئی تحقیقات سے استفادہ اور یونیورسٹیوں کے دانشوروں کے تعاون کی ضرورت سماجی نظاموں کی تشکیل اور تنظیم کے لئے ضروری ہے کہ حوزہ علمیہ ان نظاموں کے بارے میں آج کی دنیا میں جو کام ہوئے ہیں ان سے ضروری حد تک واقف ہو۔ یہ واقفیت فقیہ کو اس بات پر قادر بنا دے گی کہ ان کاموں میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے اس کو سمجھ کے، کتاب و سنت کے اشاروں اور تصریحات سے استفادے کے لئے اس کے اندر ضروری حضور ذہن پیدا ہو اور وہ اسلامی افکار کی بنیاد پر جامع اور مکمل طور پر امور معاشرہ چلانے کے نظاموں کا ڈھانچہ تیار کرے۔

حوزہ علمیہ کے ساتھ ہی ملک کی یونیورسٹیاں بھی اس سلسلے میں توانائی بھی رکھتی ہیں اور فریضہ بھی۔ یہ حوزہ علمیہ اور یونیورسٹی کے تعاون کا موضوع ہو سکتا ہے۔ یونیورسٹی کا بڑا کام یہ ہے کہ عوامی اور حکومتی نظاموں سے متعلق علم بشریات میں ناقدانہ اور محققانہ مدد کے ذریعے، دانش عالم میں رائج نظریات میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط، اس بات کا تعین کرے اور حوزہ علمیہ کے تعاون سے دینی افکار کو مناسب شکل میں پیش کرے۔

اسلام کے عالمی پیغام کے دائرے میں تمدنی اختراعات:

۵۔ اسلامی تمدن کے بنیادی اور ذیلی خطوط کا تعین اور معاشرے میں اس کے بیان، ترویج اور کلچر کی تیاری:

یہ حوزہ علمیہ سے نمایاں ترین توقع ہے۔ شاید اس کو ایک بڑی آرزو اور بلند پروازی قرار دیا جائے۔ ۱۹۶۳ میں مدرسہ فیضیہ پر حملے کے بعد اس تاریخی رات میں،

جب امام طاب ثراہ نے اپنے گھر کے اندر نماز عشا کے بعد تھوڑے سے محدود اور مرعوب طلبا سے گفتگو کی تو آپ کے یہ جملے کہ "یہ جلے جائیں گے اور آپ باقی رہیں گے" بعض لوگوں کی نگاہ میں ایک آرزو اور بلند پروازی سے تعبیر کئے گئے ہوں، لیکن مرور ایام نے ثابت کر دیا کہ ایمان، صبر اور توکل رکاوٹوں کے پہاڑ کو بھی اکھاڑ پھینکتا ہے اور دشمن کی سازش سنت الٰہی کے مقابلے میں ناکام ہو جاتی ہے۔

"اسلامی تمدن کی تشکیل" انقلاب کا برترین دنیاوی ہدف ہے۔ یعنی ایسا تمدن جس میں علم، ٹیکنالوجی، انسانی اور قدرتی ذخائر، سبھی توانائیاں، سبھی انسانی ترقیات، حکومت، سیاست، فوجی طاقت اور جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے، سب سماجی انصاف اور عوامی رفاہ کے لئے ہو اور سب سے، طبقاتی فاصلے کم کرنے، معنوی تربیت بڑھانے، علمی بلندی، فطرت کی روز افزوں معرفت اور ایمان کے استحکام کے لئے کام لیا جائے۔ اسلامی تمدن، توحید اور اس کے معنوی، انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں پر مبنی ہے۔ جنس، رنگ، زبان، قومیت اور جغرافیے کے لحاظ سے نہیں بلکہ انسانیت کے نقطہ نگاہ سے، انسان کی تکریم پر مبنی ہے۔ عدل و انصاف اس کے مصادیق اور زاویوں پر منحصر ہے۔ مختلف میدانوں میں انسان کی آزادی پر منحصر ہے۔ جہاں جہاں بھی جہادی موجودگی کی ضرورت ہو ان سبھی میدانوں میں عام مجاہدت پر منحصر ہے۔ اسلامی تمدن موجودہ مادی تمدن کا نقطہ مقابل ہے۔ مادی تمدن جو استعمار کے آغاز سے، ملکوں پر قبضے، کمزور اقوام کی تحقیر، مقامی لوگوں کے قتل عام، علم کے دوسروں کی سرکوبی کے لئے استعمال، ظلم، جھوٹ، طبقاتی خلیج اور زور زبردستی سے شروع ہوا اور تدریجی طور پر اخلاقی اصولوں سے انحراف، بدعنوانی اور جنسی تفریق بھی اس میں شامل ہو گئے اور اس نے نمو حاصل کیا۔

آج اس تمدن کی جس کی بنیاد ہی کج رکھی گئی تھی، کامل شکل اور آشکارا نمونے مغربی ممالک اور ان کی پیروی کرنے والے ملکوں میں ہم دیکھ رہے ہیں: بھوک اور افلاس کی کھائیوں کے ساتھ دولت و ثروت کے پہاڑ۔ طاقت کے پجاریوں کی، جس پر بھی ان کا زور چل جائے، زور زبردستی، علم سے لوگوں کے قتل عام کے لئے کام لیا جانا، جنسی بے راہ روی کو گھرانوں میں داخل کر دینا، حتیٰ بچوں اور نونہالوں تک پہنچا دینا، بے مثال ظلم اور سنگدلی، جس کے نمونے غزہ اور فلسطین میں نظر آ رہے ہیں، دوسروں کے امور میں مداخلت کے لئے جنگ کی دھمکی، حالیہ ادوار میں امریکی حکام کے کردار اس کے نمونے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ باطل تمدن ختم ہونے والا ہے اور مٹ کے رہے گا۔ یہ خلقت کی سنت ہے۔ اِنَّ الباطِلَ کانَ زَهوقاً[1] فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذهَبُ جُفاءً»[2]

آج ہمارا فریضہ سب سے پہلے اس باطل کے ابطال میں مدد کرنا ہے اور دوسرے اپنی توانائی بھر اس کی جگہ نظریاتی اور عملی طور پر نیا تمدن پیش کرنا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ "دوسرے نہیں کر سکے تو ہم بھی نہیں کر سکیں گے" مغالطہ ہے۔ دوسرے جہاں بھی حساب کتاب سے، ایمان اور استقامت کے ساتھ آگے بڑھے، اپنا کام کر گئے اور کامیاب رہے۔ اس کا واضح نمونہ جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، اسلامی انقلاب اور اسلامی جمہوریہ ہے۔ اس مجاہدت میں، نقصانات، چوٹیں، درد اور مفارقتیں ہیں جنہیں برداشت کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں کامیابی یقینی ہے۔ پیغمبر اعظم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) رات میں، خفیہ طور پر، مکہ سے بت پرستوں کے درمیان سے باہر آئے اور غار میں پنہاں ہو گئے۔ لیکن آٹھ سال بعد طاقت اور شکوہ کے ساتھ مکہ میں قدم رکھا اور کعبہ کو بتوں اور مکہ کو بت پرستوں سے پاک کیا۔ ان آٹھ برسوں میں بے شمار تکالیف اٹھائیں اور حمزہ جیسے اصحاب سے ہاتھ دھو بیٹھے لیکن کامیاب ہوئے۔

۱۔ سورہ اسرا آیت نمبر ۸۱«۔۔۔۔ ہاں باطل ہمیشہ نابود ہونے والا ہے

۲۔ سورہ رعد آیت نمبر ۱۷«۔۔۔۔ لیکن جھاگ اوپر آگیا اور ختم ہونے والا ہے

ظالم اور جھوٹی عالمی طاقتوں کے اتحاد کے مقابلے میں ہمارا آٹھ سالہ دفاع مقدس اس کا دوسرا نمونہ ہے۔ آج قم کا عظیم اور کارآمد حوزہ علمیہ، جس کو شروع میں مصیبتوں کا سامنا رہا، ہمارے سامنے موجود ایک اور نمونہ ہے۔ اور اس طرح کے بے شمار نمونے مل سکتے ہیں۔

اس میدان میں حوزہ علمیہ کے کندھوں پر سنگین فریضہ ہے اور وہ پہلے درجہ میں، نئے اسلامی تمدن کے بنیادی اور ذیلی خطوط کا تعین اور اس کے بعد اس کا بیان، ترویج اور معاشرے میں اس کی ثقافت تیار کرنا ہے اور یہ بلاغ مبین کے برترین مصادیق میں سے ہے۔

اسلامی تمدن کے خدوخال تیار کرنے کے حوالے سے فقہ اپنے طور پر اور علم معقولات اپنے طور پر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہمارا اسلامی فلسفہ اپنے بنیادی مسائل کے لئے سماجی خطوط تیار کرے اور ہماری فقہ اپنے میدان کو وسیع تر کرکے، استنباط اختراع اور نئے مسائل کے ذریعے اس تمدن کا احصا اور اس کے احکام کا تعین کرے۔

اجتہاد اور موضوع کی صحیح شناخت میں دو عنصر پر توجہ کی تاکید فقاہت (فقہ کے امور) اور اس کی روش کے بارے میں امام بزرگوار کا واضح بیان حوزہ علمیہ کے رہنما دستاویز ہے۔ اس بیان میں روش استنباط، وہی روایتی فقہ کی روش اور آپ کے الفاظ میں اجتہاد جواہری ہے۔ زمان و مکان اجتہاد کے دو فیصلہ کن اور اہم عنصر ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی مسئلے میں ماضی میں کوئی حکم رہا ہو لیکن سیاست، معاشرے اور اقتصاد پر حکمفرما روابط کی تبدیلی کے بعد اب نیا فتوی سامنے آئے۔ یہ فتوے اور حکم کی تبدیلی اس لحاظ سے ہے کہ ممکن ہے کہ بظاہر مسئلہ وہی پہلے والا ہو، لیکن سیاسی و سماجی روابط کے بدل جانے سے صورتحال بدل گئی ہو اور اصل مسئلہ تبدیل ہو گیا ہو، بنابریں نئے حکم کی ضرورت پڑے گی۔

اس کے علاوہ مسلسل رونما ہونے والے عالمی واقعات اور علمی ترقی ماہر فقیہ کو کتاب و سنت کی کسی حجت کے، نئے فہم وادراک تک پہنچا دے جو شرعی حکم تبدیل کرنے کی حجت بن جائے۔ جیسا کہ اکثر و بیشتر مجتہدین کی رائے بدل جاتی ہے۔ بہر حال فقہ کو فقہ ہی رہنا چاہیئے اور نئی سوچ کو شریعت کو ناخلص بنانے پر منتج نہیں ہونا چاہیئے۔

حوزہ علمیہ کی تعریف اور تشریح اور اس کے گہرے مفاہیم کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اسی پر اکتفا کروں گا اور حوزہ علمیہ قم کے بارے میں جس کے سو برس پورے ہو گئے ہیں، اختصار کے ساتھ کچھ عرض کروں گا۔

مختلف میدانوں میں حوزہ علمیہ کی موجودگی اور بالیدگی حوزہ علمیہ قم آج ایک زندہ اور بالیدہ حوزہ علمیہ ہے۔ ہزاروں مدرسین، مولفین، محققین، مصنفین، مقررین، معارف اسلامی کے مفکرین، علمی و تحقیقاتی جریدوں کی نشر واشاعت، عمومی اور مخصوص موضوعات پر لکھے جانے والے مقالات، یہ سب مجموعی طور پر آج کے معاشرے اور ملک و قوم کے مستقبل کے لئے عظیم سرمایہ ہے۔ اخلاقیات اور تفسیر کی کلاسیں، علوم عقلی کے درس اور مراکز ایسے نمایاں اور ممتاز امتیازات ہیں جو اسلامی انقلاب سے پہلے نہیں تھے۔ حوزہ علمیہ قم میں اتنی بڑی تعداد میں طلاب اور صاحب فکر افاضل کبھی نہیں تھے۔ انقلاب کے سبھی میدانوں میں فعال موجودگی حتی فوجی میدان میں فعالیت اور دفاع مقدس کے دوران، اس سے پہلے اور اس کے بعد شہید ہونے والے حوزہ علمیہ کے شہدا کی بڑی تعداد حوزہ کے عظیم افتخارات اور امام راحل کے بے شمار حسنات میں شامل ہے۔ عالمی تبلیغات کے میدان کا راستہ کھولنا اور مختلف اقوام کے ہزاروں طلبا کی تربیت اور حوزہ سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا کی دنیا کے بہت سے ملکوں میں موجودگی حوزہ علمیہ قم کا ایک عظیم، بے نظیر اور قابل تعریف کارنامہ ہے۔

جدید اور معاصر مسائل پر تازہ دم فقہائے کرام کی توجہ اور ان سے متعلق فقہ کی کلاسیں بھی درخشان مستقبل، پیشرفت اور علمی انقلاب کی نوید دے رہی ہیں۔

معتبر اسلامی متون بالخصوص کلام اللہ مجید کے علمی نکات پر نوجوان افاضل کی دقیق توجہ بھی حوزہ علمیہ میں قرآن کریم کے زیادہ مرکز بحث قرار دیے جانے کی بشارت دیتی ہے۔ خواتین کے لئے مخصوص حوزہ ہائے علمیہ کی تشکیل بھی ایک اہم اور موثر کام ہے جس کا دائمی اجر امام راحل کی روح مطہر کو پہنچ رہا ہے۔ حوزہ علمیہ قم اس نقطہ نگاہ سے ایک زندہ و بالیدہ ادارہ ہے جو امیدوں کو زندہ کر رہا ہے۔

ایک مثالی حوزہ علمیہ سے آج کے حوزہ علمیہ کی دوری کم کرنے کے لئے سفارشات

اس کے باوجود، اس منطقی توقع کی تکمیل کہ حوزہ علمیہ قم ایک پیش قدم اور مثالی حوزہ علمیہ بنے، موجودہ صورتحال میں کافی دور ہے۔ مندرجہ ذیل نکات پر توجہ یہ دوری کم کر سکتی ہے:

حوزہ علمیہ کو اپ ٹوڈیٹ ہونا چاہیئے، مسلسل آگے بڑھنا چاہیئے بلکہ زمانے سے آگے رہنا چاہیئے۔ سبھی شعبوں میں افرادی قوت کی تربیت کو اہمیت دی جائے۔ اس قوم کا راستہ اور انقلاب کا مستقبل وہ لوگ طے کریں گے جن کی آج حوزہ علمیہ میں تربیت کی جا رہی ہے۔

حوزہ علمیہ سے وابستہ افراد عوام سے اپنا رابطہ بڑھائیں۔ عوام کے درمیان افاضل حوزہ کی موجودگی اور ان سے پر خلوص رابطے کی منصوبہ بندی کی جائے۔

حوزہ علمیہ کے ذمہ داران، مناسب تدبیر سے نوجوان طلبا کے اذہان میں ڈالی جانے والی ان باتوں کو ختم کریں جو ان میں مایوسی پیدا کرتی ہیں۔ آج دنیا میں اسلام، ایران اور تشیع کو جو عزت اور احترام حاصل ہے وہ ماضی میں ہرگز نہیں تھا۔ نوجوان طلبا اس احساس کے ساتھ پڑھائی اور ترقی کریں۔

معاشرے کی نوجوان نسل کو حسن ظن کے ساتھ دیکھا جائے اور اسی نگاہ سے ان سے بات کی جائے۔ آج نوجوانوں، زیادہ ذہین نوجوانوں کا بڑا حصہ، ذہنوں میں تخریبی افکار ڈالے جانے کے باوجود دین کا وفادار اور اس کا مدافع ہے اور بہت سے دوسرے نوجوان بھی دین اور انقلاب سے عناد ہرگز نہیں رکھتے۔ دینی ظواہر سے منحرف چھوٹی سی اقلیت، حوزہ علمیہ کو غیر حقیقت پسندانہ تجزیے میں مبتلا نہ کرے۔

حوزہ کا درسی پروگرام اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ایک روشن خیال، حاضر جواب، اور جدید فقہ جو فنی طور پر اجتہادی اصولوں پر مبنی ہو، نیز واضح فلسفے کی حامل ہو اور معاشرتی زندگی کے ڈھانچے میں گہری نظر رکھتی ہو، اس کے ساتھ ساتھ مضبوط، اثر انگیز اور قابل اعتماد علم کلام بھی ماہر اساتذہ کے ذریعے پڑھایا جائے۔ یہ تینوں شعبے قرآن کی سمجھ اور تفسیری درسگاہوں کی روشنی میں نکھریں، جگمگائیں اور گہرائی حاصل کریں۔

زہد، تقوا، قناعت، غیر خدا سے بے نیازی، توکل، پیشرفت کا جذبہ، مجاہدت کے لئے آمادگی کی سفارش امام بزرگوار اور بزرگان اخلاق و معرفت نے نوجوان طلبا سے ہمیشہ شفارش کی ہے اور اس وقت بھی حوزہ علمیہ کے آپ عزیز نوجوان طلبا کو یہی سفارش کی جاتی ہے۔

حوزہ علمیہ کی تعلیمی اسناد کے بارے میں میری سفارش ہمیشہ یہ رہی ہے اور اب بھی ہے کہ سند حوزہ سے باہر کا کوئی مرکز نہیں بلکہ خود حوزہ علمیہ، طالب علم کو دے۔ البتہ حوزہ علمیہ کے درجوں کو ۱، ۲، ۳، اور ٤ کے بجائے ملک کے علمی مراکز اور دنیا میں جو نام رائج ہیں وہ دیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، گریجوئیشن، پوسٹ گریجویشن اور ڈاکٹریٹ وغیرہ۔

میں اپنی بات یہاں ختم کرتا ہوں۔ خداوند عالم سے اسلام کی روزافزوں عزت و شوکت، امت اسلامیہ کی روزافزوں طاقت و استحکام، ملت ایران کی روزافزوں پیشرفت و سعادت، حوزہ ہائے علمیہ کی روزافزوں سربلندی و توانائی، اور دشمنوں، بدخواہوں اور معاندین پر نصرت کی دعا کرتا ہوں۔ حضرت بقیۃ اللہ (ارواحنا فداہ و عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف) پر خدا کا سلام اور روح مطہر امام امت اور شہیدوں کی ارواح پر مخلصانہ درود ہو۔

والسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

سید علی حسینی خامنہ ای

۲۰۲۵/٤/۲۸

اسلام میں جوان اور جوانی کی اہم ترین خصوصیات

ڈاکٹر محمد لطیف مطہری

خلاصہ:
قرآن کریم، پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ معصومین (ع) نے جوانی کو خدا کی سب سے قیمتی نعمتوں میں سے ایک اور انسانی زندگی کی سعادت کے عظیم اثاثوں میں سے ایک اثاثہ قرار دیا ہے۔ قرآن کریم نے زندگی کے تین اہم ادوار کا ذکر کیا ہے جن کی خصوصیات کمزوری، طاقت اور ثانوی کمزوری ہیں، جو بچپن، جوانی اور بڑھاپا ہیں۔ دین اسلام میں جوانی کا زمانہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس کا انسانی زندگی کے کسی دوسرے دور سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ غیر اسلامی افکار میں نوجوانوں اور جوانوں کی عجیب و غریب تصویر پیش کی گئی ہے وہ اسے فاسد، سرکش، عاصی، طغیان گر، باغی اور ایک ناپاک مخلوق کے طور پر متعارف کراتی ہے یا کم از کم ان کی کوئی مثبت تصویر پیش نہیں کرتی ہے۔ اس تحقیق میں تحلیلی اور توصیفی طریقہ سے دین اسلام میں جوان اور جوانی کی اہم ترین خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معصومین علیہم السلام سے نقل شدہ اسلامی روایات میں جوانی کی اہمیت بہت زیادہ بیان ہوئی ہے تاکہ انسان اس قیمتی اور انمول خدادادی نعمت کو بہتر طریقے سے درک کرتے ہوئے اس اہم دور سے بہترین استفادہ حاصل کر سکیں۔

کلیدی الفاظ: نوجوان، جوان، جوانی کی اہمیت، جوانی کی خصوصیات۔

مقدمہ:

جوان زندگی کے مختلف طریقوں کو آزمانے کے لئے جدوجہد اور تلاش کرتا ہے۔ یہی تلاش اسے مجبور کرتی ہے کہ لوگوں کے مختلف رویوں اور رفتار کی جانچ پڑتال کرے اور بہترین رفتار اور اقدار کا انتخاب کرے۔ جوانی کے دور میں انسان تکامل کے مرحلے میں پہنچتا ہے، ذہانت بھی اپنی بلند ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے جوان ہر چیز کو سیکھنے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے جوانوں کے دل کی نرمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تمام لوگوں کو ان کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کی تلقین کی ہے، فرماتے ہیں: (اوصیکُمْ بِالشُّبّانِ خَیْرا فَاِنَّھُمْ اَرَقُّ اَفْئِدَۃ)[1]؛ میں آپ لوگوں کو جوانوں کے ساتھ نرمی برتنے کی سفارش کرتا ہوں، کیونکہ ان کا دل نرم ہوتا ہے۔ امام علی علیہ السلام کے نزدیک جوانی کی قدر اس کے کھونے سے ہی معلوم ہوتی ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: (شَیْئانِ لایَعْرِفُ فَضْلَھُما اِلّامَنْ فَقَدَھُما؛ اَلشَّبابُ وَالْعافِیۃُ)[2]؛ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی قدر کوئی نہیں جانتا، جب تک کہ وہ ان کو کھو نہ دے: جوانی اور صحت۔

مذہبی تعلیمات میں پاکیزگی کو جوانی کے دور کی خصوصیات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے اور اس قیمتی دور کو تزکیہ نفس اور تقرب الٰہی کے لیے استعمال کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ روایات کی رو سے جوانوں کو چاہیئے کہ وہ بڑھاپے اور مختلف دلی لگاؤ سے پہلے خود کو اچھے اخلاق سے مزین کریں۔

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد ہے: (فَضلُ الشّابِّ العابِدِ الذی تَعَبَّدَ فِي صِباہُ علی الشیخِ الذی تَعَبَّدَ بعدَ ما کبرَت سِنُّہُ کفَضلِ المُرسَلِینَ علی سائرِ النّاسِ)[3]؛ ایک عابد جوان کی فضیلت جس نے جوانی میں بندگی کی راہ انتخاب کی ہو اس عمر رسیدہ عابد سے زیادہ ہے

۱۔ شباب قریش: ص ۱، سفینۃ البحار ۲/۱۷۶

۲۔ غرر الحکم و درر الکلم، ح ۵۷۶۴

۳۔ کنز العمال: ج ۱۵ ص ۷۷۶ ح ۴۳۰۵۹.

جو اپنی عمر گزارنے کے بعد بڑھاپے میں عبادت کی طرف متوجہ ہوا ہو، جس طرح خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے رسولوں کو دوسرے تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔

دوسری طرف بعض روایات میں، ہمارے دینی رہنما جوانوں سے چاہتے ہیں کہ وہ سیکھنے کا موقع ضائع نہ کریں، کیونکہ جوانی میں سیکھنے کی ارزش اور قدر کا موازنہ استحکام اور دوام کے لحاظ سے زندگی کے دوسرے ادوار سے نہیں کیا جا سکتا۔ سیکھنے کے اعتبار سے جو فرق جوانی اور بڑھاپے میں موجود ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَن تَعَلَّمَ فِي شَبابِهِ كانَ بِمَنزِلَهِ الوَشمِ فِي الحَجَرِ، (ومَن تَعَلَّمَ وهُوَ كَبيرٌ كانَ بِمَنزِلَهِ الكِتابِ عَلى وَجهِ الماءِ)[1]؛ جو جوانی میں سیکھتا ہے اس کا علم پتھر پر کندہ کرنے جیسا ہے اور جو بڑا ہونے کے بعد سیکھتا ہے پانی پر لکھنے جیسا ہے۔

امام خمینی رہ جوانوں کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس روحی اور باطنی تصور کا اثر جوانی کے دنوں میں زیادہ بہتر حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جوان دل نرم، سادہ اور زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے۔ امام خمینی رہ کی نظر میں جوانوں کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ جوانی کے ایام کو تزکیہ نفس کا بہترین موقع قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: جوانی کے دنوں میں قلبی اور باطنی تصور کا اثر زیادہ بہتر ہوتا ہے؛ کیونکہ جوان کا دل نرم اور سادہ ہوتا ہے اور اس کی پاکیزگی زیادہ ہوتی ہے۔ اس تحقیق میں تحلیلی اور توصیفی طریقہ سے دین اسلام میں جوان اور جوانی کی اہمیت روایات کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ معصومین علیہم السلام سے نقل شدہ اسلامی روایات میں جوانی کی اہمیت بہت زیادہ بیان ہوئی ہے تاکہ انسان اس قیمتی اور انمول خدادادی نعمت کو بہتر طریقے سے درک کرتے ہوئے اس اہم دور سے بہترین استفادہ حاصل کر سکیں۔

مفہوم جوان: فارسی میں لفظ "جوان" کا مطلب ہر وہ چیز (انسان، حیوان اور پودا) ہے جس کی زندگی کا زیادہ حصہ نہ گزرا ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی قطعی تعریف کرنا ناممکن ہے جبکہ بعض کے مطابق جوان اور جوانی کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

۱۔ النوادر للراوندي: ص ۱۳۲ ح ۱۶۹

ماہرین اس بات پر متفق نہیں ہیں کہ عمر کا کونسا حصہ جوانی ہے ۔ اس لیے جوانی کی تعریف میں عمر اور زمان کے معیار کو نظر انداز کر کے دوسرے معیارات کی طرف جانا بہتر ہے ۔ جوانی انسان کے طرز عمل، اصول، عادات اور خواہشات کا ایک مجموعہ ہے جو ہر فرد میں موجود ہو اسے جوان سمجھا جاتا ہے ۔ مطالعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی اور جوان کا تصور نسبی تصورات میں سے ہے، جن کی تعریف مختلف طریقوں اور نقطہ نظر کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے ۔ درحقیقت ہر کوئی کسی خاص بنا کو مد نظر رکھتے ہوئے جوانی کو کسی خاص زمانے کے ساتھ مختص کرتا ہے ۔ البتہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ نوجوانوں کے امور کے منصوبہ سازوں اور پالیسی سازوں کے درمیان یہ اختلاف مختلف معاشروں میں بھی موجود رہا ہے اور وہ اپنے معاشروں کی خصوصیات اور ثقافتی اور سماجی عناصر کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے اہداف، پالیسیوں اور پروگراموں میں نوجوان اور جوان کے لیے مختلف حدود کا ذکر کیا ہے ۔ ماہرین نفسیات کے درمیان بھی جوانی کی حد بندی کے بارے میں اتفاق رائے نہیں ہے ۔ تاہم، جوانی کی حد بندی کے بارے میں تجویز کردہ نظریات میں سے ایک ۱۸ سے ۳۳ سال کی عمر کو جوانی قرار دیا ہے ۔

عربی زبان میں نوجوان اور جوان کے لئے مختلف الفاظ استعمال ہوئی ہے جیسے (مراہق) (غلام) (فتي) (شاب) وغیرہ ۔[1]

(مراہق) سے مراد وہ فرد ہے جو بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہے یا نزدیک ہے ۔

(غلام) سے مراد وہ فرد ہے جو ابھی تک بالغ نہیں ہوا ہے یا بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہے ۔

(فتي) سے مراد وہ انسان ہے جو بلوغت کی عمر کو پہنچ چکا ہے اور اس کا چہرہ تر و تازہ ہوتا ہے ۔

---

1. في اللغة العربية يطلق على الإنسان عدّة ألفاظ منذ أن يُصبح جنيناً في بطن أُمّه حتّى يبلغ الشيخوخة ، وقد ذكرها العلاّمة المجلسي عن كتاب سر الأدب للثعالبي : «قال في سر الأدب في ترتيب أحوال الإنسان : هو مادام في الرحم جنين ، فإذا ولد فوليد ، ثمّ مادام يرضع فرضيع ، ثمّ إذا قطع منه اللبن فهو فطيم ، ثمّ إذا دبّ ونما فهو دارج ، فإذا بلغ طوله خمسة أشبار فهو خماسي ، فإذا سقطت رواضعه فهو مثغور ، فإذا نبتت أسنانه بعد السقوط فهو مثغر ، فإذا تجاوز العشر أو جاوزها فهو مترعرع وناشئ ، فإذا كاد يبلغ الحلم أو بلغه فهو يافع ومراهق ، فإذا احتلم واجتمعت قوّته فهو حرور ، واسمه في جميع هذه الأحوال غلام ، فإذا اخضرّ شاربه قيل : قد بقل وجهه ، فإذا صار ذا فتاء فهو فتى وشارخ ، فإذا اجتمعت لحيته وبلغ غاية شبابه فهو مجتمع ، ثمّ مادام بين الثلاثين والأربعين فهو شاب ، ثمّ هو كهل إلى أن يستوفي الستين ، وقيل : إذا جاوز أربعاً وثلاثين إلى إحدى وخمسين ، فإذا جاوزها فهو شيخ» . (بحار الأنوار : ج ٦٠ ص ٣٥١) .

(شاب) اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عمر ۳۰ سے ۴۰ سال کے درمیان ہوتا ہے۔
البتہ احادیث اور عربی نصوص میں اس کے خلاف بھی شواہد ملتے ہیں۔ بعض اسلامی نصوص کے مطابق جوانی کی حد بندی بلوغت سے تیس سال تک بیان کی ہے۔ امام صادق علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں: (إِذَا زَادَ الرَّجُلُ عَلَى الثَّلَاثِينَ فَهُوَ كَهْلٌ وَ إِذَا زَادَ عَلَى الْأَرْبَعِينَ فَهُوَ شَيْخٌ)[1]
اگر کسی آدمی کا تیس سال مکمل ہوجائے تو اسے درمیانی عمر (ادھیڑ عمر) کہا جاتا ہے اور اگر کسی آدمی کا چالیس سال مکمل ہوجائے تو اسے شیخ (بوڑھا) کہا جاتا ہے۔ اس روایت کے مطابق جوانی کی انتہائی حد تیس سال ہے۔
جوانی کی ابتدا کے بارے میں سورہ یوسف میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: (وَ لَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْماً وَ عِلْماً وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ)[2] جب وہ بڑا ہوا تو ہم نے اسے علم اور حکمت عطا کی اور ہم نیک لوگوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ اس آیت کے مطابق بلوغت کے اختتام کو جوانی کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے۔
علامہ طباطبائی رہ "بلوغ اشد" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جوانی کا آغاز ہے اور یہ بات واضح ہے کہ چالیس سال جوانی کا آغاز نہیں ہے۔

جوانی کی اہم ترین خصوصیات:

اسلامی متون میں جوان اور جوانی کی اہم ترین خصوصیات موجود ہیں جن میں سے بعض خصوصیات کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔
۱۔ مستعد اور آمادہ: جوانی کے آغاز میں انسان کا دل ایک خالی زمین کی مانند ہوتا ہے جس میں بیج کی رشد اور نشوونما کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ موروثی خصوصیات کی مناسبت اور اس نے حمل اور بچپن کے دوران اپنے گردونواح سے جو کچھ علم، ہنر اور بصیرت حاصل کیا ہے وہ اپنے اندر حفظ کرتا ہے۔
امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے بیٹے امام حسن علیہ السلام کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (فی وَصِيَّتِهِ لِابْنِهِ الحَسَنِ(ع)- : إِنَّمَا قَلْبُ الحَدَثِ كَالأَرْضِ الخَالِيَةِ

۱۔ بحار الأنوار: ج ۷۵، ص ۲۵۳۔
۲۔ یوسف: ۲۲۔

مَا أُلْقِيَ فِيهَا مِن شَيءٍ قَبِلَتهُ فَبَادَرتُكَ بِالأَدَبِ قَبلَ أن يَقسُوَ قَلبُكَ وَ يَشتَغِلَ لُبُّكَ)[1] نوجوان کا دل خالی زمین کی مانند ہے کہ جو کچھ اس میں ڈالا جائے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اس لیے میں نے اس سے پہلے کہ تمہارا دل سخت ہو جائے اور تمہاری فکر مشغول ہو جائے تمہاری تربیت میں جلدی کی ہے۔

انسان اپنی خداداد اور اور موروثی صلاحیت کے ساتھ زندگی کا آغاز کرتا ہے اور موروثی اور ماحولیاتی سرمائے کے ساتھ تربیت کے میدان میں داخل ہوتا ہے، اور جو کچھ ہم انہیں تربیت دیتے ہیں وہ رشد حاصل کر لیتے ہیں۔ جوانی کے دور میں ان کی کارکردگی دیگر ادوار کے مقابلے زیادہ ہے۔

دوسری طرف بعض روایات میں، ہمارے دینی رہنما جوانوں سے چاہتے ہیں کہ وہ سیکھنے کا موقع ضائع نہ کریں، کیونکہ جوانی میں سیکھنے کی ارزش اور قدر کا موازنہ استحکام اور دوام کے لحاظ سے زندگی کے دوسرے ادوار سے نہیں کیا جا سکتا۔ سیکھنے کے اعتبار سے جو فرق جوانی اور بڑھاپے میں موجود ہے، اسے نبی کریم اس طرح بیان فرماتے ہیں: (مَن تَعَلَّمَ في شَبابِهِ كانَ بِمَنزِلَهِ الوَشمِ فِي الحَجَرِ، ومَن تَعَلَّمَ وهُوَ كَبيرٌ كانَ بِمَنزِلَهِ الكِتابِ عَلى وَجهِ الماءِ)[2]؛ جو جوانی میں سیکھتا ہے اس کا علم پتھر پر کندہ کرنے جیسا ہے اور جو بڑا ہونے کے بعد سیکھتا ہے پانی پر لکھنے جیسا ہے۔

جوانی میں انسان کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے زیادہ چیزوں کو قبول کرتا ہے۔ زندگی کے اس دور میں انسان کی تعلیم زندگی کے دوسرے ادوار میں سیکھنے سے کہیں زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں: جو شخص جوانی میں علم حاصل کرتا ہے اس کا علم پتھر پر لکیر کی مانند ہے۔

بلاشبہ یہ تشبیہ بچپن کے دور کے لئے بھی آیا ہے لیکن جوانی کے دور میں انسان کی زیادہ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ روحی اور جسمانی صلاحیتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سیکھنے کی صلاحیت بہت ہی زیادہ ہے۔ جوانی میں انسان کی اعلیٰ قبولیت کی بہترین مثال قرآن کریم کی تلاوت ہے جس کے بارے میں روایت میں صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے۔

۱۔ نہج البلاغۃ: الکتاب ۳۱۔

۲۔ النوادر للراوندي: ص ۱۳۲ ح ۱۶۹۔

۲۔شدید ذہنی تناؤ: جوانی کی ایک اور خصوصیت شدید ذہنی تناوَ ہے، جسے روایت میں "جنون" اور "سکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

(الشَّبابُ شُعبَةٌ مِن الجُنُونِ)[۱] جوانی جنون کا ایک حصہ ہے۔

جوانی کی مستی جوان سے سوچنے سمجھنے کی طاقت چھین کر اسے غلط کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ زیادہ تر انسان کے جسمانی تبدیلیوں اور فطری دباؤ اور جنسی پختگی کے تقاضوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس الجھن کا ایک اور مظہر نوجوان کی ذہنی تھکاوٹ کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے بہت زیادہ نیند بھی آتی ہے۔

(عن ابن مسكان ،عن يعقوب الاحمر قال : سألته عن صلاة الليل في أول الليل، قال : نعم ما رأيت ، ونعم ما صنعت ثم قال : إن الشاب يكثر النوم فأنا آمرك به) ابن مسکان یعقوب احمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا : میں نے امام سے نماز شب کے بارے میں پوچھا جو میں نے رات کے شروع میں ہی پڑھی تھی۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کتنا اچھا عقیدہ ہے اور کتنے اچھے طریقے سے انجام دیا ہے! پھر آپ نے فرمایا کہ جوان بہت زیادہ سوتا ہے اس لیے میں نماز شب کو (نوجوانوں کے لیے رات کے شروع میں) پڑھنے کا حکم دیتا ہوں۔

یہ خصوصیت اگرچہ اس دور کے لیے ضروری ہے اور کسی حد تک طبیعی ہے، لیکن اس سے بڑی حد تک کے لئے روک تھام کی جا سکتی ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ جوانی میں سب سے اہم چیز یہی جوش وجذبہ ہے۔ ہمیں جوانی کے اس جوش وجذبہ کے شعلے کو نہیں بجھانا چاہیے۔ اس مدت کے دوران، مختلف انسانی صلاحیتیں ترقی اور سرگرمی کی بے مثال سطح تک پہنچ جاتی ہیں، جیسے حسن دوستی، لذت طلبی، کمال طلبی، قدرت طلبی اور تحصیل علم وغیرہ جوانی کی عبوری حالت، خاص طور پر اس کے ابتدائی سالوں میں جب جسمانی اور روحی تبدیلیاں اس کے اندر آ رہی ہو تو یہ اسے ایسے رویے کی طرف لے جاتی ہیں جس سے انسان یہ احساس کر لیتا ہے کہ یہ سب ایک احمقانہ اور بیہودہ افکار کا نتیجہ ہو سکتا ہے اسی لیے

۱۔ کتاب من لایحضرہ الفقیہ : ج ۴ ص ۳۷۷ ح ۵۷۷۴.

بعض اوقات ایسے رفتار کو بچگانہ رفتار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ حالت کسی حد تک طبیعی ہے اور اگر کوئی نوجوان ایسا سلوک نہ کرے تو حیران ہونا چاہیے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: خداوند متعال کو ایک ایسے جوان سے تعجب ہوتا ہے جو لاپرواہی سے کام نہیں لیتا ہے۔ دوسری طرف شدید ذہنی تناؤ اور دباؤ جوانوں سے فکری اور عقیدتی ثبات کو چھین لیتے ہیں۔

۳۔دین اور معنویت کی طرف رجحان: جوانی میں دین اور معنویت کی طرف رجحان دوسرے ادوار کی نسبت زیادہ ہے۔ جوان معنویت اور کمال کی تلاش میں رہتا ہے۔ دین جوانوں کو حقیقی کمالات اور اس کی خوبصورتیوں سے آشنا کرتا ہے اور ان کی لطیف اور نرم روحوں کو کامل ترین ہستی سے جوڑتا ہے جو دیگر مخلوقات کا خالق ہے۔ اسی آشنائی اور تعلق کی روشنی میں جوان کو اپنی اصل شناخت اور مقام کا علم ہو جاتا ہے۔

بلوغت کے دیگر پہلوؤں کے ساتھ ساتھ، جوانوں میں مذہب کا رجحان ابھرتا ہے۔ بلوغت کی آمد کے ساتھ ہی نوجوانوں میں مذہبی جذبات اور دینی رجحانات بیدار ہوتے ہیں اور انہیں روحانی تعلیمات سیکھنے کی طرف مائل کرتے ہیں لیکن اس دور کے گذرنے کے بعد اس شدید اور سلگتی ہوئی فطری خواہش کی شدت اور میل میں کمی آجاتی ہے اور رفتہ رفتہ ایمان و اخلاق کی خواہش ایک عام خواہش بن جاتی ہے۔

مذہبی تعلیمات میں پاکیزگی کو جوانی کے دور کی خصوصیات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے اور اس قیمتی دور کو تزکیہ نفس اور تقرب الٰہی کے لیے استعمال کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ روایات کی رو سے جوانوں کو چاہیے کہ وہ بڑھاپے اور مختلف دلی لگاؤ سے پہلے خود کو اچھے اخلاق سے مزین کریں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد ہے:

(فَضلُ الشّابِّ العابِدِ الذی تَعَبَّدَ في صِباهُ علی الشیخِ الذی تَعَبَّدَ بعدَ ما کبرَت سِنُّهُ کفَضلِ المُرسَلِینَ علی سائرِ الناسِ)[۱]

ایک عابد جوان کی فضیلت جس نے جوانی میں بندگی کی راہ انتخاب کی ہو اس عمر رسیدہ عابد سے

۱۔ کنز العمال: ج ۱۵ ص ۷۷۶، ح ۴۳۰۵۹۔

زیادہ ہے جو اپنی عمر گزارنے کے بعد بڑھاپے میں عبادت کی طرف متوجہ ہوا ہو، جس طرح خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے رسولوں کو دوسرے تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔
امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: جوانوں پر زیادہ توجہ کرو، کیونکہ وہ کسی بھی بھلائی کو انجام دینے کے لئے زیادہ جلدی کرتے ہیں۔
تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے زیادہ تر وفادار، مزاحمتی اور صبر کرنے والے زیادہ تر اصحاب جوانوں پر مشتمل تھے۔
قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں اس نکتہ کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قوم کے جوان تھے جو ان پر ایمان لائے تھے اور فرعون اور اس کے کارندوں کے خوف کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو قبول کرتے تھے۔

(فَمَا ءَامَنَ لِمُوسىٰٓ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِۦ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَمَلَإِيْهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ .....)[1]
چنانچہ موسیٰ پر ان کی اپنی قوم کے چند افراد کے سوا کوئی ایمان نہ لایا، فرعون اور اس کے سرداروں کے اس خوف کی وجہ سے کہ کہیں وہ انہیں مصیبت سے دوچار کر دیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: (عَلَيكَ بِالأَحداثِ فَإِنَّهُم أسرَعُ إلى كُلِّ خَيرٍ)[2]
امام صادق علیہ السلام: نوجوانوں پر توجہ دو، یہ گروہ کسی بھی نیکی کے کام کو دوسروں سے جلدی قبول کرتے ہیں۔
مصعب بن عمیر مکہ کے امیر خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک جوان تھا جو اچھی اخلاقی صفات کا حامل تھا، جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اسلام قبول کر دیا۔ لیکن اس نے اپنے دشمنوں کے ایذا رسانی اور دباؤ کی وجہ سے اپنا ایمان ظاہر نہیں کیا۔ ایک دن عثمان بن طلحہ نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، تو اس نے مصعب کی والدہ کو اطلاع دی کہ ان کے بیٹے نے اسلام قبول کر لیا ہے، مصعب کی والدہ اور اس کے رشتہ دار سب ناراض ہو گئے اور اسے قید کر دیا، لیکن اس نے اپنا ایمان نہیں چھوڑا۔

۱۔ یونس ۱۰: آیہ ۸۳
۲۔ ری شہری، میزان الحکمہ، ج ۵، ص ۴۶۲، ح ۹۲۵۵

ایک دن مصعب بن عمیر بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، آپ ص نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: (اُنظُروا إلی رَجُلٍ قَد نَوَّرَ اللّٰهُ قَلبَهُ، و لَقَد رَأَیتُهُ و هُوَ بَینَ أبَوَیهِ یُغَذِّیانِهِ بِأَطیَبِ الأَطعِمَةِ وأَلیَنِ اللِّباسِ، فَدَعاهُ حُبُّ اللّٰهِ و رَسولِهِ إلی ما تَرَونَ)[1]

اس شخص کی طرف دیکھو جس کے دل کو خدا نے روشن کر دیا ہے۔ میں نے اسے اس وقت بھی دیکھا ہے جب اس کے والدین اسے بہترین کھانا کھلاتے تھے اور بہترین لباس پہناتے تھے لیکن اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے اسے اس طرح مشکل زندگی گزارنے پر مجبور کیا ہے۔

امام علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ مصعب بن عمیر ایک پشمینہ کپڑا پہنے ہوئے داخل ہوئے جو چمڑے کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے اس حالت میں دیکھا تو رونا شروع کر دیا کیونکہ پہلے وہ خوشی اور سکون کی زندگی گزار رہا تھا اور اب فقیروں کی مانند زندگی گزار رہا ہے۔

مصعب بن عمیر مکہ مکرمہ کا سب سے ذہین اور خوبصورت ترین جوان تھا۔ اس کے والدین اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی ماں اسے سب سے خوبصورت اور پیارے کپڑے پہناتی تھی۔ رسول خدا ﷺ ہمیشہ اس کی حالت کا ذکر کرتے اور فرماتے تھے: (ما رَأَیتُ بِمَکَّةَ أحسَنَ لِمَّةً ولا أرَقَّ حُلَّةً ولا أنعَمَ نِعمَةً مِن مُصعَبِ بنِ عُمَیرٍ)[2]

ہم نے مکہ مکرمہ میں مصعب بن عمیر سے بہتر خوشبو لگانے والا، بہتر لباس پہننے والا اور ناز و نعمت میں زندگی کرنے والا کبھی دیکھا ہے۔

عتاب بن اسید فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کے پہلے گورنر تھے، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے خود انتخاب کیا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جنگ حنین شروع ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے سپاہیوں کو مکہ چھوڑ کر محاذ جنگ پر جانا پڑا۔

۱۔ المحجۃ البیضاء: ۸/۵؛ حلیۃ الأولیاء: ۱/۱۰۸، کنز العمال: ۱۱/۷۴۷/۳۳۶۵۰ و ج ۱۳/۵۸۲/۳۷۴۹۴

۲۔ المستدرک علی الصحیحین: ج ۳ ص ۲۲۱ ح ۴۹۰۴.

دوسری طرف اس شہر کے انتظامی امور کو منظم طور پر چلانے کے لئے ضروری تھا کہ ایک قابل اور لائق فرد کو گورنر مقرر کیا جائے جو لوگوں کے معاملات کو صحیح طریقے سے چلائے اور دشمنوں کی طرف سے پیش ہونے والے ممکنہ خطرات اور پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے کیونکہ شہر مکہ تازہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا تھا۔

رہبر اسلام نے تمام مسلمانوں میں سے ایک اکیس سالہ عتاب بن اسید نامی نوجوان کو اس عظیم منصب کے لیے منتخب کیا اور اس کے نام پر ایک حکم جاری کیا اور اسے لوگوں کی جماعت کی قیادت سنبھالنے کا حکم دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عتاب بن اسید سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کس عہدے کے لیے منتخب کیا ہے؟ میں نے تمہیں خدا کے حرم اور مکہ کے باشندوں کا حاکم بنایا ہے۔ اور اگر مسلمانوں میں کوئی تم سے زیادہ لائق ہوتا تو میں اسے چن لیتا۔ عتاب بن اسید پہلا شخص تھا جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اس شہر میں باجماعت نماز قائم کی۔

اکیس سالہ جوان کی اس عہدے پر تقرری نے بہت سے لوگوں کو ناراض کیا! کچھ لوگوں نے شکایت کرتے ہوئے کہنا شروع کر دیا: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے ہیں کہ ہم عاجز، پست اور ذلیل بنیں اسی لئے ایک غیر تجربہ نوجوان کو عرب کے مشایخ اور حرم کے بزرگوں پر امیر اور حاکم بنایا ہے!

جب یہ باتیں مکہ سے باہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کانوں تک پہنچیں تو آپ نے مکہ والوں کو خط لکھا اور کھل کر عتاب ین اسید کے فضائل واعمال کی تعریف کی اور اس بات پر زور دیا کہ تمام لوگ اس کے حکم کی تعمیل اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ خط کے آخر میں یہ خوبصورت جملہ لکھا: (وَلا' یَحْتَجّ مُحتَجٌ مِنْکُم فی مُخ'الفَتہِ بِصِغَرِ سِنّہِ! فَلَیْسَ الاُ کْبَرُ هُوَ الاَفضَل بَلِ الاَفْضَلُ هُوَ الاَ کْبَر)[1]

اس کی چھوٹی عمر کو اس کی نااہلی کی دلیل بنا کر پیش مت کرو کیونکہ بڑا آدمی برتر نہیں ہوتا بلکہ افضل اور برتر بڑا ہوتا ہے!

۱۔ مجلسی،،بحار الأنوار: ج ۲۱ ص ۱۲۳ ح ۲۰

عتاب بن اسید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے آخر تک مکہ مکرمہ کے گورنر رہے اور شاندار خدمات انجام دیں۔

اسامہ بن زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری سپہ سالار تھے جسے آپ نے رومیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ بعض اصحاب نے اس انتخاب کے بعد اس کی مخالفت شروع کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے درحالیکہ آپ کو سخت بخار تھا اور فرمایا: اے لوگو! یہ میں کیا سن رہا ہوں کہ تم لوگ اسامہ کے انتخاب پر شکوک و شبہات پیش کر رہے ہو۔ آج تم اس کے سپہ سالار بننے پر شک کر رہے ہو اور طعنہ دے رہے ہو جس طرح اس سے پہلے بھی اس کے باپ کی سپہ سالاری کا مذاق اڑاتے تھے، خدا کی قسم، وہ قیادت اور سپہ سالاری کے لائق تھے جس طرح آج اس کا بیٹا قیادت اور سپہ سالاری کے لائق ہے۔ اس لئے آپ نے اس کے احکامات پر عمل کرنے پر تاکید فرمایا اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں پر لعنت بھیجی۔

دین کی طرف نوجوانوں کا میلان اس حد تک ہے کہ بعض اوقات افراط کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور اعتدال سے ہٹ جاتا ہے۔ یقیناً اس پر خوش نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس قسم کی رجحانات سے انہیں خبردار کرنا چاہیے۔ جوانوں میں دین کی تعلیمات اور معارف کو سمجھنے کی قدرت موجود ہوتی ہے اسی وجہ سے احادیث میں نوجوانوں اور جوانوں کی دینی تعلیم و تربیت کو اساتذہ کرام اور والدین کے اہم ترین فرائض میں شمار کیا گیا ہے۔ جوانوں کا دین اور معنویت کی طرف رجحان اس کی انفرادی اور سماجی زندگی اسی طرح اس کی شخصیت میں اثرانداز ہوتا ہے۔ دین جوانوں کے کمال پرستی اور خیر خواہی کے استعداد اور خواہش کو نہ صرف پورا کرتا ہے بلکہ انہیں خدا سے جوڑ کر، ہدایت اور معنویت کے نمونے اسے فراہم کر کے اسے ایک شناخت فراہم کرتا ہے۔

جوان کا روح نہایت ہی لطیف، مہربان اور پاکیزہ ہوتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ اور زندگی کے گزرنے کے ساتھ ساتھ، جو خواہشات، طرز عمل، خیالات اور دیگر کیفیتوں اور خصوصیات

کے ساتھ ہوتی ہے، اس کے روح میں تبدیلی آئے اور مہربان اور نرم ی سے تبدیل ہو کر سختی اور قساوت میں بدل جائے۔جس کے نتیجے میں دین کی طرف رجحانات تبدیل ہو کر دین گریزی میں بدل جائے۔

جوانوں کی دینداری اور حقیقت جوئی کو بے ضرر نہیں سمجھنا چاہیے اگر ہم ان کے ساتھ صحیح طریقے سے اور جوانوں کو درک کرتے ہوئے مناسب رفتار سے پیش آئیں تو ہم ان کے عقائد کو درست کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

امام صادقؑ جوانوں کی زیادہ اثر قبول کرنے والی صفت کے بارے میں فرماتے ہیں: (مَنْ قَرَأَ الْقُرآنَ وَهُوَ شابٌّ مُؤمِنٌ اِختَلَطَ الْقُرآنُ بِلَحمِهِ وَدَمِه)[1]

جو شخص قرآن پڑھتا ہے، اگر وہ جوان باایمان ہو تو قرآن اس کے گوشت اور خون میں مخلوط ہوتا ہے اور اس کے جسم کے تمام بافتوں کو متاثر کرتا ہے۔

مذہب قلبی سکون اور روح کی تسکین کا ذریعہ ہے اور یہ انسان کو بہت سی پریشانیوں، اضطراب اور خوف سے نجات دلاتا ہے اور یہ بنی نوع انسان کے لیے ایک قابل اعتماد اور ضروری تکیہ گاہ ہے۔ وہ جوان جو کسی کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا اور تمام طاقتور سے بغاوت کرتا ہے، وہ اندر ہی اندر اپنی کمزوریوں اور کمتری کا ادراک کرتا ہے اور اپنی عظمت، طاقت اور بقا کو مذہب میں دیکھتا ہے۔ مذہب میں فلسفہ زندگی اور حیات کو تلاش کرتا ہے اور اس میں اپنی زندگی کا مقصد ڈھونڈلیتا ہے۔ وہ اپنے دماغ کی طاقت سے مذہب اور دینی مفاہیم کی خود تحقیق کرنا چاہتا ہے اور حقائق کا پتہ لگانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اپنے عقائد کا تجزیہ کرکے وہ تکامل کی راہ ہموار کرتا ہے۔

۴۔ جوانی، جسمانی طاقت سے بھرپور: جوانی ایک ایسا دور ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ''طاقت'' کی خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جوانی کے زمانے میں انسان کی جسمانی اور بدنی صلاحیتیں پختگی اور رشد کے آخری مراحل کو پہنچ جاتی ہیں، اس میں جوش و جذبہ اور تحرک بہت ہی توانا ہوجاتا ہے، اس طرح سے کہ بعض اوقات بغیر کسی تدبیر کے

۱۔ محمد علی بن محمد حسن اردکانی، تحفۃ الأولیاء ج ۴، ص ۶۱۶، ح ۳۴۹۰

قدرت نمائی شروع کرلیتا ہے ۔ اس کی جسمانی طاقت کو مشکل سماجی سرگرمیوں جیسے جہاد اور کھیلوں کے مقابلوں اور معاشی سرگرمیوں میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ ہمیں سب سے پہلے اس کی اس جسمانی قوت کو صحیح سمت میں ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ پھر انہیں معنوی صلاحیتوں کو حاصل کرنے اور مطلوبہ خصوصیات پیدا کرنے کی دعوت دینی چاہیے ۔

5- عظیم ذہنی اور علمی صلاحیتوں کے مالک: وانی کے دور میں جب انسان تکامل کے مرحلے میں پہنچتا ہے ، ذہانت بھی اپنی بلند ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے ۔ اس لئے جوان ہر چیز کو سیکھنے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے ۔ جوانوں میں سوچ و فکر کی قوت بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس قوت کی بدولت بہت سی مشکلات حل ہوجاتی ہیں ۔ فکر کی طاقت جوان کو تھیوری اور نظریہ پردازی کی صلاحیت دیتی ہے اور وہ کسی بھی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو تلاش کرکے اس کے نتائج کو بیان کر سکتا ہے ۔ فکر کی روشنی میں جوان مستقبل میں اپنے لئے ایک خوبصورت دنیا کا تصور کرتا ہے اور تخلیقی صلاحیتوں کی طرف رخ کرتا ہے ۔ یہ نفسیاتی کیفیت ، تخیل کی قوت کو بڑھاتی ہے اور جوانوں کے ذہنوں میں تخلیقی قوت بخشتی ہے ، جوانوں کے ذہنوں میں جدت اور پہل کا جذبہ بیدار کرتی ہے اور انہیں تجدید اور کمال کے حصول کے لیے تیار کرتی ہے ۔

انسان کا ادراک ، علمی اور فکری صلاحیتیں جوانی میں کام کرنا شروع کر دیتی ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتیں آہستہ آہستہ مکمل ہوجاتی ہیں ۔ جوان اپنی جوانی سے پہلے مرحلہ میں استنباطی اور انتزاعی چیزوں کو سمجھنے کے قابل نہیں تھے اور صرف ان چیزوں کو یاد کرتے اور بیان کرتے تھے جو انہیں بتایا گیا ہو یا یاد کروایا گیا ہو ۔ اس دور میں وہ ان چیزوں کو سمجھنے اور مسائل کا تجزیہ کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ دینی مسائل اور خدا کے حلال و حرام کی تعلیم دینے کے لئے یہ زمانہ نہایت ہی بہترین اور موزوں زمانہ ہے ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت نقل ہوئی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں :

(قَالَ: يَثَّغِرُ الْغُلَامُ لِسَبْعِ سِنِينَ وَيُؤْمَرُ بِالصَّلَاةِ لِتِسْعٍ وَيُفَرَّقُ بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ لِعَشْرٍ وَيَحْتَلِمُ لِأَرْبَعَ عَشْرَةَ سَنَةً وَمُنْتَهَى طُولِهِ لِاثْنَتَيْنِ وَعِشْرِينَ سَنَةً وَمُنْتَهَى عَقْلِهِ لِثَمَانٍ وَعِشْرِينَ سَنَةً إِلَّا التَّجَارِبَ)[1]

بچے کے دودھ کے دانت سات سال کی عمر میں گر جاتے ہیں اور نو سال کی عمر میں اسے نماز کا حکم دینا چاہیے ۔ دس سال کی عمر میں ان کا بستر الگ کر دینا چاہیے اور ۲۱ سال کی عمر میں اس کا قد اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے ، اور ۲۸ سال کی عمر میں ، وہ اعلیٰ ترین فکری رشد کو پہنچ جاتا ہے ، سوائے تجربات (اور فنون) کے جو اس کے بعد بھی اسے حاصل ہو جاتا ہے بعض محققین کے مطابق یہ اوقات عقلی پختگی کے عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں ، نہ رشد عقل کے وقت کو معین کرتا ہے ۔ معصومین علیہم السلام کی طرف سے جوانوں سے مشورہ لینے اور انہیں ذمہ داریاں سونپنے اور علم سیکھنے کا ذمہ دار ٹھہرانے کی سفارش اس مراحل میں عقلی رشد اور نشوونما کی اہمیت کی نشاندہی کرتی ہے ۔

امیر المومنین علیہ السلام جوانوں کی بصیرت اور ذہنی رفتار کو بوڑھوں سے زیادہ سمجھتے ہیں ۔ جوانی کا دور بلوغت کے آغاز سے چالیس سال کی عمر تک کو شامل ہے ۔ آپ جوانوں سے مشورت کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں :

(إِذَا احتَجتَ إِلَى المَشورَةِ فِي أَمرٍ قَد طَرَأَ عَلَيكَ فَاستَبدِهِ بِبِدايَةِ الشُّبّانِ ؛ فَإِنَّهُم أَحَدُّ أذهانا ، وأَسرَعُ حَدسا ، ثُمَّ رُدَّهُ بَعدَ ذلِكَ إلى رَأيِ الكُهولِ وَالشُّيوخِ لِيَستَعقِبوهُ ويُحسِنُوا الاِختِيارَ لَهُ ؛ فَإِنَّ تَجرِبَتَهُم أكثَرُ)[2]

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں- : جب بھی تمہیں نصیحت کی ضرورت ہو تو سب سے پہلے نوجوانوں سے مشورہ کرو۔ کیونکہ فہم و فراست کے اعتبار سے وہ بہت تیز ہوتے ہیں ۔ اس کے بعد اسے بزرگ اور بوڑھے افراد کے سامنے پیش کرو تا کہ وہ ان کی جانچ پڑتال کریں اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کریں کیونکہ ان کا تجربہ جوانوں سے زیادہ ہے ۔

۱۔ حر عاملی، ج ۱۹، ص ۳۴۶، ح ۲۴۷۷۰

۲۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ ، ج ۲۰، ص ۳۳۷، ح ۸۶۶

6- جوان اور کم علمی: نوجوان کی فکری اور علمی پختگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس اب اعلی قسم کا علم موجود ہو، بلکہ جوانی کے دور میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مزید علم حاصل کرنے کا امکان زیادہ موجود ہے جیسا کہ جوانوں کا منحرف گروہوں سے متاثر ہونا اس بات کا ثبوت ہے۔ جوانوں کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر انہیں ضروری بنیادی معلومات فراہم کی جائیں تو وہ اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات اہم ہے کہ ان معلومات کو صحیح طریقے سے اور اس کی ذہنی اور روحی خصوصیات کے مطابق پیش کرنا چاہیے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (جَهْلُ ٱلشَّبَابِ مَعْذُورٌ وَ عِلْمُهُ مَحْقُورٌ) [1]

نوجوانوں کی جہالت بھی قابل معافی ہے اور ان کا علم بھی کم ہے۔

7- حساسیت اور جلد ناراضگی: جوانی کا دور، خاص طور پر جوانی کی ابتدائی مراحل احساساتی طور پر نہایت ہی حساس اور نازک ہوتا ہے کہ تھوڑی سی مخالفت، ملامت اور سرزنش کو برداشت نہیں کرتا۔ اس نقطہ نظر سے انسان کو اس کے ساتھ بات کرنے اور برتاؤ میں زیادہ محتاط رہنے اور اس کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرنے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔

نوجوانوں کی حساسیت اور چڑچڑا پن، خاص طور پر جوانی کے ابتدائی سالوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے، جو بتدریج خواہشات اور روحانی طور پر متوازن ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی آجاتی ہے۔ اس مرحلے میں یقیناً تمام جوان ایک ہی سطح کا نہیں ہے لہذا حساسیت اور جلد ناراض ہونے کی یہ صفت عارضی ہے۔

امام علی علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں: (إذا عاتَبتَ الحَدَثَ فَاترُك لَهُ مَوضِعا مِن ذَنبِهِ لِئَلاّ يَحمِلَهُ الإِخراجُ عَلَى المُكابَرَةِ) [2]

جب بھی تم کسی نوجوان کی سرزنش کریں تو اس کے لیے اپنے گناہ کی توجیہ پیش کرنے کا راستہ چھوڑ دو تاکہ ہٹ دھرمی اور دشمنی کا باعث نہ بنے۔

۱۔ غرر الحکم و درر الکلم، جلد ۱، صفحہ ۳۳۹، حدیث: ۱۷، ۴۵۴۹

۲۔ شرح نہج البلاغۃ: ج ۲۰ ص ۳۳۳ ح ۸۱۹.

8۔ خوبصورت طلبی اور خوبصورتی کی تلاش: حسن اور خوبصورتی کی خواہش جوان کی فطری خصوصیات میں سے ہے۔ وہ اپنی پاک روح کی وجہ سے شاداب اور خوش رہتا ہے۔ رہبر معظم کے بقول: جہاں بھی جوان ہیں وہاں تازگی، طراوت، شادابی اور نیکی ہے۔ جب میں جوانوں کے ساتھ اور جوانوں کے ماحول میں ہوتا ہوں تو مجھے اس شخص کی طرح محسوس ہوتا ہے جو صبح کی ہوا میں سانس لے رہا ہو، میں تازگی اور شادابی محسوس کرتا ہوں۔ جوان خوبصورتی کا عاشق ہے۔ وہ خود کو خوبصورت بنانا چاہتا ہے اور اسے خوبصورتی پسند ہے۔ جنسی بلوغ اور جوانی کے اس مرحلے میں انسان کی خوبصورتی کی خواہش اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح سے کہ بعض اوقات اسے جوانوں کے انحراف کے عوامل میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ اس احساسات اور خواہشات پر پوری طرح توجہ دینا اور اس کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کے بارے میں دینی رہنماوں اور پیشواؤں کی بہت زیادہ تاکید موجود ہیں۔ معصومین علیہم السلام سے روایت ہے: (قَالَ وَرُوِيَ: أَنَّ حَلْقَ الرَّأْسِ مُثْلَةٌ بِالشَّبَابِ وَوَقَارٌ بِالشَّيْخِ)[1] جوان کے لیے سر منڈوانا اذیت کا باعث بنتا ہے جبکہ بوڑھے افراد کے لیے یہ وقار اور عزت کا باعث ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: (انّ أحبّ الخلائق الى الله تعالى شابٌّ حدث السّنّ في صورةٍ حسنةٍ جعل شبابه و ماله في طاعة الله تعالى ذاك الّذى يباهى الله تعالى به ملائكته فيقول عبدى حقّاً)[2]

بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزیز وہ کم عمر اور خوبصورت جوان ہے جو اپنی جوانی اور خوبصورتی کو خداوند متعال کی اطاعت اور بندگی میں صرف کرتا ہے۔ خداوند متعال اپنے برتر فرشتوں کے سامنے اس جوان پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ میرا سچا بندہ ہے۔ دینی راہنما قدرتی حسن پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ بیرونی خوبصورتی کی بھی سفارش کرتے ہیں۔

۱۔ السرائر، جلد ۳، صفحہ ۶۴۰، حدیث: ۳۶۶۴۴۸

۲۔ أعلام الدين: ص ۱۲۰.

امام حسن مجتبی علیہ السلام نے نماز کے وقت اپنے آپ کو سنوارنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: (إنَّ اللهَ جَمیلٌ یُحِبُّ الجَمال)[1]؛ خدا خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے قنبر کے لیے لباس کا انتخاب کرتے وقت اس کے لیے ایک خوبصورت اور پر تعیش لباس کا انتخاب کیا اور خوبصورتی کی طرف جوانوں کے فطری میل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (أنتَ شابٌّ ولكَ شرةُ الشَّباب)[2]؛ تم جوان ہو اور تمہارے لیے جوانی کی خوشی اور اس کی رغبت ہے۔

جوان کی حس زیبائی اسے معنوی اور اخلاقی خوبصورتیوں کی جستجو اور تلاش کے پیچھے لے جا سکتی ہے۔ جوانوں کو حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ: (یَزَةُ الرَّجُل عَقْلُه وجَمالُه مُرُوَّتُه)[3]؛ مرد کی فضیلت اس کی عقل، اس کے حسن، اس کی مردانگی اور اس کے اخلاقی اوصاف میں ہے۔

9۔ آزادی اور استقلال کی خواہش: بچپن اور نوجوانی کے برعکس، جوانی کا دور خاندان پر انحصار سے علیحدگی اور اپنی صلاحیتوں اور ذاتی طاقت اور خود مختاری پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کا دور ہے۔ جوان آہستہ آہستہ اور شعوری طور پر اپنے لیے ایک نئی دنیا کا نقشہ کھینچتا ہے جس میں مرکزی کردار اس کا اپنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خاندان سے الگ سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو رائے اور عمل کی طاقت کا حقدار سمجھتا ہے۔ وہ اب اس چیز کو قبول نہیں کرتا کہ دوسرا کوئی اسے حکم دے اور سرزنش کریں۔ وہ چاہتا ہے کہ دوسرے افراد اسے ایک ایسی فرد کے طور پر دیکھیں جو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے اور اپنے معاملات کو خود سنبھالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۱۰۔ جوانوں کا مختلف سرگرمیوں میں شرکت: جوان مختلف سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش ہوتا ہے، درحقیقت جوانوں کی مختلف سرگرمیوں میں شرکت بھی ان کی آزادی اور استقلال کی رجحان کے مطابق ہے۔ اسلامی متون کے مطابق، جوانی کا دور وزارت کا دور ہے۔

۱۔ الکافی، جلد ۶، صفحہ ۴۳۸، حدیث: ۱۱۶۳۱۱

۲۔ بحار الأنوار: ج ۴۰ ص ۳۲۴ ح ۶

۳۔ میزان الحکمۃ، جلد ۹ صفحہ ۱۱۰، تصنیف غرر الحکم ص ۲۵۸۔

یہ بات واضح ہے کہ وزیر کی اپنے کام میں آزادی مطلق اور کامل نہیں ہے، بلکہ وزیر ریاست کے سربراہ کے ماتحت ہے۔ اگرچہ وزیر اپنے کام کے میدان میں آزاد اور خود مختار ہے، لیکن اسے حکومت کے انتظامی قواعد و ضوابط کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔

11-نرم دلی اور لچک

جوان جس نے ابھی تک اپنی زندگی کے کئی سال نہیں گزارے ہیں یقینا بہت ہی کم تعلقات اور وابستگی رکھتا ہے۔ اگر یہ تعلقات اپنی معمول کی حالت سے آگے بڑھ کر مضبوط خصلت اور خصوصیت میں تبدیل ہوجائیں تو اس کے نتیجے میں وہ اپنے موقف پر استقامت اور بے جا اصرار کرتا ہے۔ انسان کی وابستگی اور انحصار جتنا کم ہوتا اتنا ہی وہ جلد حقیقت کو تسلیم اور اقرار کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جوانوں میں بڑوں کی نسبت زیادہ پشیمانی، ندامت اور معاف کرنے، دشمنی اور کینہ توزی نہ کرنے کی صفت زیادہ موجود ہے۔

نوجوانوں کی نرم دلی اور انعطاف پذیری ایک ایسا موضوع ہے جسے قرآن کریم کی آیات سے بھی استنباط کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

(بإسناده إلى إسماعيل بن الفضل الهاشميّ قال: قلت لجعفر بن محمّد عليه السّلام: أخبرني عن يعقوب عليه السّلام لمّا قال له بنوه يا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ، قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي. فأخّر الاستغفار لهم، و يوسف عليه السّلام لمّا قالوا له قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِنْ كُنَّا لَخَاطِئِينَ. قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ. قال: لأنّ قلب الشّابّ أرقّ من قلب الشّيخ، و كان جناية ولد يعقوب على يوسف و جنايتهم على يعقوب إنّما كانت بجنايتهم على يوسف، فبادر يوسف إلى العفو عن حقّه، و أخّر يعقوب العفو لأنّ عفوه إنّما كان عن حقّ غيره، فأخّرهم إلى السّحر ليلة الجمعة) [1]

۱۔ تفسیر اہل بیت علیہم السلام ج ۷، ص ۶۰ ۱بحار الأنوار، ج ۱۲، ص ۲۸۰/ علل الشرایع، ج ۱، ص ۵۴/ قصص الأنبیاء للجزایری، ص ۱۸۰

اسماعیل بن فضل ہاشمی نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا: حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بچوں کے لیے استغفار میں تاخیر کیوں کی درحالیکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فوراً اپنے گناہگار بھائیوں کو معاف کر دیا اور ان کی مغفرت کے لئے دعا کی۔

آپ نے فرمایا: پہلی بات یہ ہے کہ جوان بوڑھے کی نسبت زیادہ نرم دل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کی معذرت کرنے سے جلدی متاثر ہوئے اور انہیں فوراً معاف کر دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بچوں نے حضرت یوسف علیہ السلام پر ظلم کیا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حق کو معاف کیا جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے حق خداوندی کو معاف کروانا تھا۔

تیسری بات یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے استغفار کو اس لئے ملتوی کر دیا تاکہ روز جمعہ سحر کے وقت میں ان کے لئے استغفار کر سکے۔

۱۲- جوان کی آرزوئیں اور لمبی امیدیں: خیلات اور خواہشات بذات خود جوانوں کے لیے ایک قسم کی رضایت ارمغان لاتا ہے، اور (وصف العیش نافِ العیش) کے مطابق خیالات، توہمات اور تخیلات کی دنیا میں پرواز کرنے سے کسی نہ کسی قسم کی روحانی لذتیں حاصل ہوتی ہیں، خواہ عارضی ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ خواب ہیں جو نوجوانوں کو آرمان گرا اور آئیڈیلسٹ بناتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: (الأملُ رَحمةٌ لِاُمّتي، ولَولا الأملُ ما أرضَعَتْ والِدَةٌ وَلَدَها، ولا غَرَسَ غارِسٌ شَجَرا)[1]

آرزو اور امید میری امت کے لیے ایک رحمت ہے۔ اگر امید نہ ہوتے تو کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ نہ پلاتی اور نہ کوئی باغبان درخت لگاتا۔ لیکن جو چیز نقصان اور خطرے کا باعث بنتی ہے اور جوان کو زوال کے دہانے پر لا کھڑی کرتی ہے، وہ بہت ہی غیر معقول اور غیر حقیقی آرزوئیں اور امیدیں ہیں۔

۱۔ بحار الأنوار: ۷۷/۱۷۳/۸.

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (ما أطالَ عَبْدٌ الأملَ إلاّ أساءَ العَمَلَ)[1] کسی نے اپنی آرزو کو طولانی نہیں کیا مگر یہ کہ اس کا عمل کو ضائع ہوا ہے۔

امام علی علیہ السلام ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: (أَيّها النـاسُ! وَ إِنَّ أَخْـوَفَ مَـا أَخَافُ عَلَيْكُمُ اثْنَانِ: اتِّبَاعُ الْهَوَى وَ طُولُ الْأَمَلِ. فَأَمّا اتِّبَاعُ الْهَوى فَيَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ، وَ أَمَّا طُولُ الأَمَلِ فَيُنْسِي الْآخِرَةَ)[2]

اے لوگو مجھے تمارے بارے میں سب سے زیادہ دو باتوں کا ڈر ہے۔ ایک خواہشوں کی پیروی اور دوسرا امیدوں کا پھیلاو۔ خواہشوں کی پیروی وہ چیز ہے جو حق سے روک دیتی ہے اور امیدوں کا پھیلاو آخرت کو بھلا دیتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کتنا برا ہے وہ جوان جس کے طولانی خواب و خیال اور لمبی امیدیں ہو۔

نتیجہ:

جوان اور جوانی کے بارے میں دین اسلام کا نظریہ حق اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اسلام جوانوں کے کچھ ایسی خصوصیات کو جنھیں ہم منفی سمجھتے ہیں، جوانی کے دور کے لیے مناسب اور ضروری سمجھتا ہے لیکن ان خصوصیات کی یقیناً رہنمائی اور تربیت کرنے کی ضرورت ہے یہ خصوصیات مقطعی اور عرضی ہیں اور ایسا ہرگز نہیں ہیں کہ یہ خصوصیات زندگی کے اختتام تک ہمیشہ جوانوں کے ساتھ رہیں۔

جوانی اگرچہ ایک نامعلوم فضیلت ہے لیکن غنیمت یہ ہے کہ انسان اس قیمتی چیز کی قدر و قیمت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس سے کماحقہ فائدہ اٹھائے۔ دینی متون میں اس مجہول فضیلت کو ایک خزانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جوان کی آرزو یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس خزانہ کی قدر و قیمت کو سمجھے اور اس خزانے سے فائدہ اٹھائے۔ جوانوں کو ذمہ داری دے کر اور ان کی حق میں دعا کرنے سے کے وہ اس قیمتی خزانے کو زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جوانی کے دور کی خصوصیات ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تشکیل اور تکمیل کی بنیاد بنتی ہیں۔

۱۔ بحار الأنوار: ۷۳/۱۶۶/۲۸۔
۲۔ نہج البلاغہ، الخطب: ۴۲۔

منابع

قرآن کریم
نہج البلاغہ

۱. ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۳۸۷۔
۲. ابن ادریس حلی، محمد، مستطرفات السرائر، قم، جامعہ مدرسین، ۱۴۱۱ ق۔
۳. اعلام الدین، حسن دیلمی، قم موسسہ آل البیت،
۴. آمدی، غرر الحکم، دارالکتاب، قم، بی تا۔
۵. بحارالانوار، محمد باقر مجلسی، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۴۰۳ ق۔
۶. بستانی، محمود، اسلام وروان شناسی، ترجمہ محمود ہویشم، مشہد، انتشارات آستان قدس رضوی، ۱۳۷۲۔
۷. بیانات مقام معظم رہبری حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای، دیدار با جوانان، کیہان، ۱۳۷۹/۸/۱۰
۸. جوان از نظر عقل واحساسات، محمد تقی فلسفی، تہران، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۳۷۸۔
۹. چہل حدیث، امام خمینی رح، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی رح، ۱۳۷۴۔
۱۰. حاجی دہ آبادی، حسینی زادہ، بررسی مسائل تربیتی جوانان در روایت، ص ۳۲۔
۱۱. حاکم نیشاپوری، محمد بن عبداللہ، المستدرک علی الصحیحین، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۱ ق۔
۱۲. حر عاملی، محمد بن حسن، تفصیل وسائل الشیعۃ إلی تحصیل مسائل الشریعۃ، قم، موسسۃ آل البیت: ، چاپ اول، ۱۴۰۹ ہ ق.
۱۳. دہخدا، علی اکبر، لغت نامہ دہخدا، تہران، دانشگاہ تہران، چاپ دوم، ۱۳۷۷۔
۱۴. رضائی اصفہانی، محمد علی، تفسیر موضوعی میان رشتہ ای قرآن وعلوم، تہران، نشر تلاوت، ۱۳۹۴
۱۵. شرح غرر الحکم ودرر الکلم، جمال الدین محمد خوانساری، دانشگاہ تہران، ۱۳۶۰۔
۱۶. شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، داراحیاء التراث العربی، ۱۳۸۵ ق۔
۱۷. شہید مرتضی مطہری، تعلیم وتربیت، تہران صدرا، ۱۳۸۳
۱۸. صدوق، من لایحضرہ الفقیہ، قم، جامعہ مدرسین، حوزہ علمیہ، ۱۴۰۵ ق
۱۹. صدوق، ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین، علل الشرائع، بیروت، دارالاحیاء التراث العربی، ۱۳۸۵ ق۔
۲۰. طباطبائی، محمد حسین، المیزان، ترجمہ: محمد باقر موسوی ہمدانی، قم، انتشارات اسلامی، ۱۳۷۴۔
۲۱. طوسی، ابی جعفر محمد بن حسن، امالی، قم، دارالثقافہ، ۱۴۱۴ ق۔
۲۲. فیروز اللغات اردو جامع لاہور (فیروز سنز پرائیوٹ لمیٹڈ) ۳۵۴۔
۲۳. قمی، عباس، سفینۃ البحار، تہران، فراہانی، بی تا۔
۲۴. کلینی، محمد بن یعقوب بن اسحاق، الکافی، تہران، دارالکتب الإسلامیۃ، چاپ چہارم، ۱۴۰۷ ہ ق.
۲۵. متقی ہندی، علی بن حسام الدین، کنز العمال، بیروت، موسسہ الرسالۃ، ۱۴۰۹ ق۔
۲۶. مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، تہران، دارالکتب الاسلامیہ، بی تا۔
۲۷. محب، رضا۔ تربیت، سہ ماہی سماجی، دینی، تحقیقی مجلہ نور معرفت، جلد ۱۰ شمارہ ۴۵ (۲۰۱۹ عیسوی)، ۲۸،
۲۸. محمدی ری شہری، حکمت نامہ جوان، قم، دارالحدیث، ۱۳۸۴۔
۲۹. محمود منصور، روان شناسی ژنتیک تحول روانی از تولد تا پیری، ص ۲۰۴۔
۳۰. معاونت مطالعات وتحقیقات سازمان ملی جوانان، جوانان در نظام بین الملل، تہران، سازمان ملی جوانان، ۱۳۸۷۔
۳۱. معین، محمد، فرہنگ فارسی، جلد ۱، (تہران، انتشارات کبیر، ۱۳۶۰، شمسی) ۱۰۶۳۔
۳۲. منصور، محمود، روان شناسی ژنتیک، تحول روانی از تولد تا پیری، تہران، رشد، ۱۳۷۴۔
۳۳. نعمانی، محمد بن ابراہیم، الغیبہ، تہران، مکتبہ الصدوق، بی تا۔
۳۴. ورام، الزاہد ابو الحسین، تنبیہ الخواطر ونزہۃ النواظر، تہران، دارالکتب العلمیہ، ۱۳۶۸۔

اسلامی انقلابِ ایران، انقلابِ روس اور فرانس کا تقابلی جائزہ

قمر عباس نانجی

خلاصہ:
اس تحقیق میں ابتدائی طور پر انقلاب کی تعریف کی گئی ہے اور اسکے بعد کسی بھی انقلاب کی پیمائش کے لئے چند اہم معیارات بیان ہوئے ہیں، اور ساتھ ہی ان معیارات کی روشنی میں ان تینوں انقلاب (یعنی فرانس، روس اور اسلامی انقلابِ ایران) پر تجزیہ اور تحلیل کیا گیا ہے اور اس بنیادی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ ان تینوں انقلاب میں سے وہ کون سا انقلاب ہے جس میں عوامی شرکت شدید سیاسی اور عسکری دباؤ کے باوجود اپنے عروج پر تھی۔ اس سوال کا جواب دینا اس لئے ضروری ہے کہ ہمیں کسی بھی انقلاب پر تجزیہ و تحلیل کرنے میں مدد ملے گی، اور اس سوال کے جواب کی روشنی میں کسی بھی انقلاب کو پرکھنے اور تولنے کا میزان ہمارے ہاتھ آجائے گا، نتیجتاً ہم باآسانی سمجھ سکیں گے کہ موردِ بحث تین انقلاب (روس، فرانس اور اسلامی انقلاب) میں وہ کون سا انقلاب ہے جس کے لئے راستہ ہموار تھا، انقلاب کے مراحل بھی دشوار نہ تھے اور جسکا کامیابی سے ہمکنار ہونا نسبتاً آسان تھا اور اس کے مقابلے میں وہ کون سا انقلاب ہے جس کے لئے شرائط بہت سخت اور دشوار تھیں اور کٹھن حالات کو طے کرتے ہوئے اپنی کامیابی کی نوید سنائی اور آج تک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم و دائم ہے۔ اس تحقیق کے نتائج یہ ہیں کہ ان تینوں انقلاب میں سے انقلاب اسلامی ایران وہ واحد انقلاب ہے جسکا سامنا نسبتاً طاقتور سلسلے سے تھا، حالات بہت کٹھن تھے اور سیاسی اور عسکری طاقت اپنے عروج پر تھی اسکے باوجود عوامی شرکت کے لحاظ سے یہ انقلاب دیگر تمام انقلاب سے ممتاز دیکھائی دیتا ہے۔

کلیدی الفاظ: اسلامی انقلاب، تقابل، ایران، روس، فرانس

مقدمہ:

ساری دنیا اور خصوصاً اسلامی دنیا کے ضعیف، کمزور اور پابرہنہ افراد جو اپنے بنیادی حقوق سے محروم کر دیئے گئے ہیں اور ظالم حکومتوں اور سامراج کے ہاتھوں مظلوم واقع ہوئے ہیں، ان تمام ظلم و ستم کو سہنے کے باوجود لفظ انقلاب سے ابھی بھی پُر امید ہیں، اور دلی آرزو رکھتے ہیں کہ تعصّب سے بالاتر ہو کر دنیا بھر میں رونما ہونے والے بڑے بڑے انقلاب کو زیر بحث لایا جائے اور کامیاب ترین انقلاب کے تجربوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے اپنے معاشرے میں ظالم اور سامراجی حکومتوں اور ریاستوں کے خلاف انقلاب کی فضا ہموار کی جائے، یہ تحقیق ان لوگوں کے لئے امید کی ایک کرن ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اس تحقیق میں ان عناصر اور اسباب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اجو سخت سیاسی حالات کے باوجود ایک انقلاب کی کامیابی کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

اس موضوع کو انتخاب کرنے کی چند بنیادی وجوہات ہیں، ایک یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں انقلاب اور اس سے متعلق موضوعات پر تحقیقاتی کام نہ ہونے کے برابر ہے اور نہ ہی عوام الناس میں انقلاب سے متعلق خاطر خواہ آگاہی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام فہم لوگ ہر ایسی جماعت اور رہبر کے شانہ بشانہ کھڑے ہوجاتے ہیں جو انقلاب کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اس عدم آگاہی کے پیش نظر ضرورت ہے کہ انقلاب کی درست تعریف اور اسکے مصداق سے درست آشنائی پیدا ہو۔ دوسری طرف جاننا ضروری ہے کہ کُرہ ارض کے ان تین نامور انقلاب یعنی: فرانسیسی انقلاب، روسی انقلاب اور اسلامی انقلاب ایران میں سے کون سا انقلاب، کس جہت سے دوسرے انقلاب پر فوقیت اور برتری رکھتا ہے، کس انقلاب کی تاثیر دیرپا ہے؟ اور ہمارے پاس وہ کیا معیارات ہیں جس کے ذریعے ہم چند انقلاب کو آپس میں موازنہ کرسکتے ہیں؟ اس کے علاوہ اس بحث کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ہم انقلاب کے عناصر اور اسباب کو سمجھ سکیں گے، کہ کیسے ایک انقلاب برپا ہوتا ہے، انقلاب کی راہ میں رکاوٹیں اور آفات کیا ہیں؟ انقلاب کے خطرات کیا ہیں، اور کیسے ایک انقلاب خطروں سے عبور کرتے ہوئے کامیابی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

انقلاب کی تعریف:

لفظ انقلاب جسے عربی میں 'ثورہ' اور انگریزی زبان میں (REVOLUTION) کہا جاتا ہے۔ لغت کے اعتبار سے یہ عربی لفظ ہے جو قلب سے لیا گیا ہے جس کے معنی دل ہیں۔ اسی طرح قالب، قلوب، مقلّب، تقلیب وغیرہ سب الفاظ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ دل کو قلب اسی لئے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنی حالت بدلتا رہتا ہے، یعنی مسلسل حرکت میں ہوتا ہے یا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف حرکت کرتا ہے۔ بعض الفاظ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ابتدائی معنوں کے ہمراہ مختلف علوم میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ انہی الفاظ میں سے ایک لفظ انقلاب ہے، جو ستارہ شناسی، طب، اقتصادی اور اجتماعی علوم کے علاوہ دیگر علوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لہذا دیگر الفاظ کی طرح لفظ انقلاب بھی عربی لغت کے علاوہ سیاسی اور اجتماعی علوم میں رفتہ رفتہ استعمال ہونے لگا۔ البتہ علمِ اجتماع کی رو سے معاشرے میں آنے والی ہر تبدیلی کو انقلاب نہیں کہا جاتا، بلکہ اُس خاص معاشرتی تبدیلی کو انقلاب کہا جاتا ہے جو ناگہانی ہو، ایک ہی دفعہ میں تبدیلی ہو، ہمہ پہلو ہو (یعنی معاشرے کے تمام پہلوؤں میں تبدیلی کا مشاہدہ ممکن ہو)، اور اس تبدیلی کے پیچھے نظریہ یا آئیڈیالوجی کارفرما ہو اور یہ تبدیلی ایک نقشے کے تحت ہو۔

دوسرے الفاظ میں علوم جامعہ شناسی کی رو سے کسی بھی انقلاب میں تین خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے:

۱. ایسی حرکت جس کے پیچھے ارادہ اور ایک خاص ہدف کارفرما ہو
۲. اس حرکت کا مقدس اور طاقتور ہونا
۳. موجودہ حالت سے پوری طرح سے نارضایتی کا پایا جانا۔[۱]

مختلف انقلاب کی پیمائش کے چند اہم معیارات:

کسی بھی معاشرے کی قدرت و طاقت کے چند اہم ستون ہوتے ہیں، مثلاً اُس ملک کا اقتصادی استحکام، عسکری اور فوجی طاقت، بین الاقوامی حمایت اور انتظامی امور کی باگ دوڑ، اجتماعی امور میں عوام کی شراکت اور حمایت، قیادت اور آئیڈیالوجی وغیرہ۔

۱۔ مطہری، پیرامون انقلاب اسلامی، ص ۸۲

یہاں اجتماعی طاقت سے ہماری مراد اس ملک کے بسنے والے لوگوں کے اعتقادات، رجحانات، تخیلات، مذہبی رجحانات، مشاغل، رسومات، فرہنگ، ثقافت اوراس قسم کی دوسری چیزیں ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ جو سرزمین سیاسی قدرت کے لحاظ سے ضعیف ہو وہ سرزمین انقلاب کے لیئے زیادہ ہموار ہوتی ہے۔[۱] البتہ اس نظریہ سے فقط جزئی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے چونکہ فرانسیسی اور روسی انقلاب میں اس نظریہ کے درست ہونے کے شواہد دیکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس انقلاب اسلامی ایران میں چند دوسرے اسباب ہیں جو انقلاب میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔

اگر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ان تین انقلاب میں سے کون سا انقلاب اپنے اندر زیادہ توانائی اور طاقت رکھتا ہے تو ہمیں جاننا ہوگا کہ ان تینوں انقلاب کے مدمقابل جو حکومتی یا شہنشاہی نظام برسر اقتدار تھا اُسکی ''سیاسی قدرت اور طاقت'' کس درجے کی تھی؟ یا دوسرے الفاظ میں انقلاب فرانس، روس اور انقلاب اسلامی ایران میں سے کس انقلاب کا سامنا سب سے زیادہ طاقتور سلسلے سے تھا؟ اگرچہ تینوں انقلاب بظاہر کامیابی سے ہمکنار ہوئے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تینوں کی کامیابی ایک ہی درجہ کی تھی بلکہ ان تینوں انقلاب کو مختلف معیارات پر پرکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ کون سا انقلاب دوسرے انقلاب پر برتری اور فوقیت رکھتا ہے۔ لہذا ان 'تینوں انقلاب کے مدّمقابل کا طاقتور یا ضعیف ہونا' یہ وہ پہلا معیار ہے جن سے ہم ان تینوں انقلاب کی توانائیوں پر تجزیہ کرسکیں گے۔

سیاسی قدرت کا جائزہ: جیسا کہ بیان ہوا کہ کسی بھی معاشرے کی سیاسی قدرت کے چار اہم ارکان ہیں: اقتصادی استحکام، عسکری اور فوجی طاقت، بین الاقوامی حمایت اور انتظامی امور میں مہارت۔ یہ چار بنیادی ارکان کسی بھی حکومت، بادشاہت یا ریاست کو مستحکم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی حکومت کے ان چار بنیادی ارکان میں سے ایک یا چند ضعیف ہوجائیں وہ حکومت ایک متزلزل

۱۔ چالمرز جانسون، تحول انقلابی: بررسی نظری پدیدہ انقلاب، ص۴۶

حکومت شمار ہوتی ہے اور ایسی سر زمین انقلاب کے لئے زیادہ ذرخیز شمار کی جا سکتی ہے۔ پس نتیجتاً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جہاں سیاسی قدرت کے یہ چاروں ارکان مضبوط ہوں، ایسی سر زمین انقلاب سے نسبتاً کم سازگاری رکھتی ہے، اور ایسی سر زمین پر ایک انقلاب کا کامیابی سے ہمکنار ہونا اس انقلاب کے لئے ایک امتیاز شمار کیا جا سکتا ہے۔

۱۔اقتصادی حالات: سیاسی قدرت کا ایک اہم رکن اقتصاد ہے۔ اقتصاد کسی بھی حکومت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اور حکومتی نظام کی تقویت میں بے حد موثّر ثابت ہوتی ہے۔ جس ملک کی اقتصادی حالت مستحکم ہو اور جہاں مالیات اور حکومتی اخراجات کی عادلانہ تقسیم بندی ہو وہاں فقر اور غربت نسبتاً کم ہوتی ہے نتیجتاً ایسی حکومتوں کو لوگوں کی طرف سے کم دباؤ کا سامنہ کرنا پڑھتا ہے۔ بہتر اقتصادی حالات کے دیگر اہم فوائد یہ ہیں کے حکومتی خزانے میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے، ملک کے زرعی اور صنعتی شعبوں میں رونق بڑھتی ہے، نتیجتاً حکومت کی سیاسی قدرت کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ لہذا وہ حکومت یا ریاست جس کی اقتصاد ضعیف ہو وہاں فطری طور پر انقلاب کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں اُس سر زمین کے مقابلے میں جہاں اقتصادی حالت مستحکم ہوں۔

فرانس: فرانسیسی انقلاب ۱۷۸۹ میلادی میں آغاز ہوا۔ انقلابِ فرانس کامیابی سے ۵۰ سال قبل ہی اقتصادی اور مالی بحران سے دوچار ہو چکا تھا۔ ایک کے بعد ایک جنگیں، غذا اور غلّہ کی قلت، خانہ جنگی اور قحط اس دوران اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔) منوچھر محمدی، انقلاب اسلامی در مقایسہ با انقلاب روسیہ و فرانس ص۷۶(تاریخ فرانس کے اکثر محققین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ فرانسیسی سلطنت کے سُقوط کے اصلی عوامل میں سے ایک انتہائی اہم عامل اقتصادی حالت کا ضعیف اور غیر مستحکم ہونا تھا۔ غذا اور آٹے کی قلت کا بحران اس قدر شدید تھا کہ باقاعدہ آٹے کی جنگ یا FLOUR WAR سے ایک تحریک کا آغاز ہوا جس میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شدت آتی گئی اور نتیجتاً سلطنتِ فرانس کی سیاسی قدرت ضعیف ہوئی اور اسکے خلاف شورشوں میں اضافہ ہوا۔

روس: روسی انقلاب جو سن ۱۹۱۷ م میں واقع ہوا، اس سر زمین میں اقتصادی بحران کی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ ایک مورخ کے بقول :

''سن (۱۹۱۱ میلادی) سے زرعی پیداوار کے لحاظ سے روس کی حالت انتہائی مایوس کن تھی، قحط کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کسان جھاڑو میں استعمال ہونے والی ٹہنی کو اُبال کر بطور غذا استعمال کرتے تھے، اور لاعلاج بیماریاں ہر جگہ پھیل چکی تھیں۔''[۱]

ایران: ایران کا اسلامی انقلاب سن ۱۹۷۹ م میں کامیاب ہوا، قبل از انقلاب شاہی حکومت اقتصادی لحاظ سے مستحکم اور قوی تھی، شاہ نے بین الاقوامی حمایت کی بنیاد پر غیر ملکی کمپنیوں کو ایران میں تجارت اور اقتصادی فعالیت کی اجازت دی، جس کے نتیجے میں ایران کے اقتصادی حالات کچھ حد تک بہتر ہوئے، شاہی حکومت کی اصل درآمد کا ذریعہ تیل تھا، غیر ملکی کمپنیوں نے ایران میں تیل کے کنویں دریافت کیے اور ایران کا تیل اپنے ملک منتقل کرنے کے بدلے ایرانی شاہی حکومت کو خوب انعامات اور دیگر سہولیات سے نوازا۔ سن ۱۹۶۳ میں تیل کی پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدنی ۴۵۰ ملین ڈالر تھی، جبکہ ۱۹۷۳ میں تیل کی آمدن بڑھ کر ساڑھے چار بلین ڈالر، اور سن ۱۹۷۷ میں تیل سے حاصل ہونے والی آمدن ۲۳ بلین ڈالر تک جا پہنچی تھی۔ (منوچھر محمدی، انقلاب اسلامی در مقایسہ با انقلاب فرانس و روس، ص۷۷) لہذا کہا جاسکتا ہے کہ انقلاب اسلامی کی کامیابی میں شاہی حکومت کے اقتصادی ضعف کا عنصر شامل نہیں۔

۲۔ فوجی اور عسکری طاقت: کسی بھی سیاسی قوت کے لئے اُس کی مسلح فوج اور عسکری طاقت سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ فوج نہ صرف سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے بلکہ سیاسی قدرت کو داخلی طور پر بھی دوام دیتی ہے۔ ریاستی ادارے حکومت کے مقابلے میں سر اٹھانے والے گروہ، بغاوت، شورشوں اور مختلف تحریکوں سے نمٹنے کے لئے عام طور پر پلیس، حساس اداروں اور مسلح افواج سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اور انہی کی مدد سے اُن تحریکوں کو سرکوب کیا جاتا جو حکومت کے مقابلے میں سر اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں، یا دوسرے الفاظ میں انقلاب کے شعلوں کو بجھانے کے لئے عسکری طاقت کا سہارا لیا جاتا ہے۔

۱۔ History Of Russian Soviet Union By Kalistov And Others, Vol ۱ ,Pg ۳۹۶)

عام طور پر چھوٹی، بڑی تمام حکومتیں اپنے سالانہ قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ فوجی اخراجات کے لئے مختص کرتی ہیں۔ لیکن اگر اقتصادی دباؤ یا دیگر وجوہات کی بنیاد پر حکومت، فوجی اخراجات سے صرف نظر کرے، یا حکومتی اور فوجی اداروں کے درمیان بعض وجوہات کی بنیاد پر اختلاف یا ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوجائے پھر فوجی وفاداریوں میں ایک ایسی دراڑ پڑھنے کا خطرہ رہتا ہے جو انقلاب کے شعلوں کو جنم دے سکتا ہے۔

فرانس: لوئیس ۱۵ (Louis ۱۵) کے زمانے میں فرانسیسی فوج نے چار بڑی جنگوں میں شرکت کی: پولینڈ کی جنگ (۱۷۳۸۔۱۷۳۳)(War Of The Polish Succession)، آسٹرین جنگ (۱۷۴۸۔۱۷۴۰)(War Of The Austrian Succession)، ہفت سالہ جنگ (۱۷۶۳۔۱۷۵۶) (Seven Year's War) اور امریکہ کی آزادی کی جنگ (۱۷۸۳۔۱۷۷۵) (War Of American Independence)۔ آخری جنگ کا دائرہ یورپ سے بڑھ کر امریکہ اور ایشیا تک جا پہنچا اور اس جنگ میں فرانس کا بڑا علاقہ اس کی سلطنت سے باہر چلا گیا۔ دوسرے ممالک کے ساتھ فوجی شراکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوج کی افرادی قوت میں بے انتہا کمی ہوئی اور فوج کا جذبہ بھی ماند پڑھ گیا۔

حکومتِ فرانس نے نہ صرف ایک بھاری رقم آسٹرین فوج کو پیش کی، بلکہ اپنے دو لاکھ فوجی آسٹریا کے حوالے کئے لیکن اس کے باوجود نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں بری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اور یوں فرانس کی سیاسی طاقت پر بھی منفی اثرات مرتب ہوئے۔

روس: سن ۱۹۰۴ میں روس اور جاپان کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے ج کا سرانجام یہ ہوا کہ روس کو شکست کا سامنا ہوا جس سے فوجیوں کا مرال ضعیف ہوا۔ روسی عوام کی رائے کے مطابق روسی حکومت کی نااہلی کی وجہ سے جنگی شعلے بھڑکے یعنی اس جنگ کو شروع ہونے سے پہلے ہی روکا جا سکتا تھا۔ اسی طرح روس چونکہ فرانس کے ساتھ متحد تھا، لہذا پہلی عالمی جنگ میں بھی روس نے اپنے فوجی روانہ کئے، مناسب تیاری نہ ہونے کے باوجود روس اپنے فوجی بھیجنے پر مجبور تھا۔ دوسری طرف مدمقابل پر جرمنی اور اسکے اتحادی بہترین اسلحے سے لیس اور پوری آمدگی کے ساتھ میدان میں اترے تھے۔

نتیجتاً روس کو اس عالمی جنگ میں بڑے خسارے کا سامنا کرنا پڑا اور روس عقب نشینی پر مجبور ہوا۔ اس شرمناک شکست کے بعد روسی حکومت کو فوجی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، فوجی مخالفت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ یکم مارچ ۱۹۱۷ میں ۱۸۰،۰۰۰ فوجی روسی حکومت کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔

ایران: فرانس اور روس کے برخلاف ایرانی افواج نے انقلاب سے قبل پچھلے پچاس برسوں میں کسی خارجی جنگ میں شرکت نہیں کی تھی اور ساتھ ہی شاہی حکومت نے فوجی وفاداری کی پائیداری پر خاص توجہ مرکوز کی ہوئی تھی، سالانہ بجٹ کا ۲۳ فیصد، اور بعض سالوں میں ۳۵ فیصد تک فوجی اخراجات کے لئے مختص تھا۔ اُس دور کی دو بڑی طاقتیں امریکہ اور روس تھیں جبکہ شاہی حکومت کا زیادہ تر جھکاؤ امریکہ کی طرف تھا، اور شاہی حکومت کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ امریکہ کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ بلاخر بادشاہ ایران امریکہ سے اپنی وفاداری ثابت کروانے میں کامیاب ہوگیا اور نتیجتاً ایران کو پورے مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کی چوکیداری کا عہدہ نصیب ہوا۔ امریکہ نے شاہی حکومت کو مضبوط کرنے اور اس خطے پر ایران کی بالادستی کے لئے شاہی حکومت کی بھرپور پُشت پناہی کی، شاہی افواج جسکی تعداد ایک لاکھ تھی وہ بڑھ کر پانچ لاکھ تک جا پہنچی، امریکہ نے ایران کے لئے جدید اسلحے کے ڈھیر لگا دیئے، اور ایرانی افواج کو بہترین عسکری تربیت دی۔ ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۰ کے درمیان شاہی حکومت نے ۱۷،۴ ملین ڈالر کی مالیت کا اسلحہ اور جنگی تدارکات خریدے۔ اور یہ رقم ۱۹۷۱ سے ۱۹۷۹ کے درمیان بڑھ کر ۲۰ بلین ڈالر تک جا پہنچی۔ یوں ایران سب سے زیادہ اسلحہ درآمد کرنے والا پہلا ملک قرار پایا۔

دوسری طرف حکومتِ شاہ کی خفیہ فوج ساواک جو اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کی تربیت یافتہ تھی۔ ساواکی شکنجے اور بے رحمی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اس خفیہ پلیس نے بڑے بڑے شاہی مخالفین کو راستے سے ہٹانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور شاہی حکومت سے اپنی وفاداری کا حق ادا کیا۔

۳۔ بین الاقوامی حمایت: دنیائے سیاست میں یہ ممکن نہیں کہ ایک ملک بین الاقوامی تعلقات، اہم دفاعی اور تجارتی معاہدوں، مختلف نوعیت کے روابط اور خصوصی تعلقات سے بے نیاز ہو۔

فرانس: فرانس نے چار خارجی جنگوں میں اپنے فوجی دوسرے خطو میں روانہ کئے لہذا فرانس کے لئے کسی غیر جانبدار ملک سے دوستانہ روابط قائم کرنا نسبتاً دشوار تھا۔ دوسری طرف فرانس کے پاس نہ صرف یورپ کے مختلف حصوں، بلکہ یورپ سے باہر دوسرے خطّوں میں بھی اپنی بڑی بڑی کالونیاں موجود تھیں۔ ان کالونیوں کی مدد سے دوسرے ممالک کے امور میں مداخلت اور تنازعات ایجاد کرنے میں بھی فرانس پیش پیش تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس کے بین الاقوامی تعلقات دوسرے ممالک کی نسبت ضعیف ہوئے۔

روس: جیسا کہ بیان ہوا کہ روس کو پہ در پہ شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس سے عوام اور فوج دونوں میں حکومت کی نسبت عدم اعتمادی کی فضا پیدا ہوئی۔ ان دو جنگوں کے درمیان روس میں سیاسی استحکام نہ تھا، اور اسی طرح اس درمیان بہت سی حکومتی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سیاسی حالات میں عدم استحکام کا نتیجہ بین الاقوامی حمایت سے محرومی کی صورت میں سامنے آیا۔

ایران: جیسا کہ بیان ہوا، شاہی حکومت اس خطے میں امریکی مفاد کی چوکیداری پر مامُور تھی، دوسری طرف امریکہ نے ایران کو مضبوط کرنے کے لئے مالی اور عسکری تعاون کئی گناہ بڑھا دیا تھا۔ نتیجتاً ایران خطے کے تمام ممالک کے سامنے ایک عظیم طاقت کے طور پر متعارف تھی۔ تمام ممالک سے بہترین تعلقات ہونے کے ساتھ ساتھ امریکہ اور اسرائیل سے خصوصی تعلقات بھی قائم تھے۔

۴۔ انتظامی امور میں مہارت: سیاسی قدرت کا چوتھا اور اہم رکن انتظامی اور سیاسی امور میں مہارت اور تدبیر ہے۔ سیاسی قدرت کو دوام بخشنے کے لئے یہ عنصر بہت اہمیت کا حامل ہے، اگر ایک حکومت ہر طرف سے مضبوط ہو، یعنی اقتصادی استحکام، عسکری اور فوجی طاقت اور بین الاقوامی حمایت یافتہ ہو، لیکن سیاسی امور میں تدبیر، مدیریت اور درست حکمت عملی کا عنصر موجود نہ ہو تو اس حکومت کی نابودی کو کسی صورت نہیں روکا جا سکتا۔

فرانس: لوئیس ۱۶ (Louis ۱۶) کا شمار فرانس کے اُن بادشاہوں میں ہوتا ہے جو فضول خرچی اور دولت کے بے جا مصرف میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھے۔ اسکے علاوہ برّصغیر اور کینیڈا میں موجود وسیع و عریض فرانسیسی کالونیاں غلط حکمت عملی کی وجہ سے انکے ہاتھوں سے چلی گئیں۔ لوئیس ۱۶ طاقت کے غرور میں خود کو فرانس کا تنہا فرد تصور کرتا تھا جو سوائے خدا کے کسی کے سامنے جواب دہ نہیں: ایک جگہ وہ کہتا ہے:

''یہ تاج خدا نے مجھے دیا ہے، قانون بنانے کا حق صرف مجھے حاصل ہے اور اس حق میں، میں کسی کا تابع اور شریک نہیں ہوں۔''[۱]

استبدادی سلسلے کی حاکمیت اور انتظامی امور میں کمزوری وہ دلائل تھے جس کی بنیاد پر روس کی سیاسی قدرت ضعیف ہوئی۔ اجتماعی گروہوں نے حکومتی کمزوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جوانوں اور دانشوروں کو اپنی طرف جلب کیا، اور نتیجتاً حکومت کی اطاعت سے منصرف کردیا، اور حکومت اس جہت سے مزید کمزور پڑھ گئی۔ ایک روسی وزیر کے بقول:

''انقلاب سے پہلے، حتی بڑے طبقات بھی حکومت کے مخالف ہوچکے تھے، مختلف عوامی اجتماعات، کلب اور بڑے بڑے ہال میں حکومت کے خلاف کھل کر تنقید اور نفرت آمیز لہجہ اپنایا جاتا تھا۔ حکومتی سربراہوں، حتی صدرِ روس کے نام پر لطیفہ اور مختلف مزاحیہ شعر بنائے جاتے تھے۔''[۲]

ایران: شاہ ایران سیاسی تدبیر کے لحاظ سے منفرد شخص تھا۔ شاہ نے اپنے ماتحت کام کرنے والوں اور فوجی سربراہوں کو اس طرح سے تربیت دی تھی کہ انہیں صرف شاہ کے حکم کی بجاوری کرنی ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا۔ حکومتی اعلیٰ عُہدوں کی تقسیم فقط اس بنیاد پر کی جاتی تھی کہ منصب حاصل کرنے والا ہمیشہ بادشاہی نظام اور صرف شاہ سے وفادار رہے گا۔

دوسری طرف ساواک (خفیہ پلیس) جو اسرائیل کی تربیت یافتہ تھی، اسکے ذریعے خفیہ معلومات جمع کرنا، مخالفین پر کڑی نگاہ رکھنا، مخالف تحریکوں کو سرکوب کرنا، بڑی بڑی تحریکوں کے رہبروں کو راستے سے ہٹانا ان تمام امور میں شاہ کی مہارت تھی۔

۱۔ آلبر مالہ وژول ایزاک، تاریخ قرن ۱۸، وانقلابِ فرانس، ص ۲۸

۲۔ کرین بریتون، کالبدشکافی چہار انقلاب، ص ۶۲

تیسری جانب ایسی خارجہ پالیسی اپنائی کہ دوسرے ممالک سے اچھے تعلقات برقرار کئے اور خصوصاً امریکہ اور اسرائیل کا اعتماد حاصل کیا۔

نتیجہ: مذکورہ بالا عناصر سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ فرانس اور روس کی سرزمین انقلاب سے قبل، آنے والے انقلاب کے لئے ذرخیز اور تیار تھی، کیونکہ ان دونوں خطوں پر ایک متزلزل اور ضعیف سیاسی قدرت حاکم تھی۔ اور بیان ہوا کہ جس سرزمین پر مقتدر حکومت کی سیاسی قدرت ضعیف ہو اس کی مثال ایک گرتی ہوئی دیوار کی سی ہے، جسے معمولی سی شورش، تحریک، بغاوت یا انقلاب کا شعلہ نابود کرنے کے لئے کافی ہے۔

اسکے مقابلے میں سرزمینِ ایران میں انقلاب سے قبل سیاسی قدرت اپنے عروج پر تھی اور شاہی حکومت ایک مستحکم اور ہر پہلو سے قوی حکومت شمار کی جاتی تھی (جس کے نمونے بھی بیان کیے گئے)۔ لہذا ہم نتیجہ لے سکتے ہیں کہ انقلابِ روس اور فرانس کے برخلاف اسلامی انقلابِ ایران کے لئے شرائط دشوار اور سخت تھیں۔ اسلامی انقلابِ ایران کا اس لحاظ سے برتر اور منفرد ہونا واضح اور روشن ہے، یعنی ایک ایسے بادشاہی نظام کے مقابلے میں یہ انقلاب برپا ہوا جو اندر سے مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی طور پر پوری طرح حمایت یافتہ تھا۔

اعتراض: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اگر مان لیا جائے کہ فرانس اور روسی انقلاب کے برخلاف اسلامی انقلاب سے پہلے ایران کا شاہی نظام اپنی پوری سیاسی قدرت کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا تو پھر ایسی سرزمین پر کیسے انقلاب برپا ہوا؟ بظاہر ایسی سرزمین سخت شرائط کے سبب انقلاب کے لئے سازگار دیکھائی نہیں دیتی ہے۔ آیا بیان ہونے والے عناصر کے علاوہ دیگر اسباب اور عوامل بھی دخیل ہیں جو انقلاب کے شعلوں کو ہوا دینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہوں؟

جواب: جیسا کہ ابتداء میں بیان ہوا تھا کہ کسی بھی معاشرے کے دو بنیادی ستون ہوتے ہیں، ایک اسکی سیاسی قدرت اور دوسری اجتماعی قدرت۔ یہ بات درست ہے کہ فرانسیسی اور روسی انقلاب میں سیاسی قدرت کا ضعیف ہونا ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسلامی انقلابِ ایران کی کامیابی میں جو عنصر سب سے زیادہ موثّر تھا وہ معاشرے کی اجتماعی

قدرت اور طاقت تھی، اور یہ اجتماعی قدرت اس قدر طاقتور اور موثر تھی کہ اس نے بڑی طاقتور اور ناقابل شکست سیاسی قدرت پر غلبہ پایا۔

اب ہم اجتماعی طاقت اور اسکے تین بنیادی ارکان کا جائزہ لیں گے، اور سمجھیں گے کہ اجتماعی طاقت کیسے ایک انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اور ساتھ ہی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ اجتماعی طاقت کے آثار فرانسیسی اور روسی انقلاب میں کس سطح پر تھے؟

اجتماعی عناصر کا جائزہ: جب کسی ملک کی سیاسی قدرت عوام کے مطالبات کو پورا کرنے سے عاجز ہوجائے یا دیگر وجوہات کی بنیاد پر اس کام کے لئے آمادہ نہ ہو، تو اجتماعی گروہ، ایسے رہبر اور قائد کی تلاش شروع کردیتے ہیں جو انہیں انکے مطالبات میں درست راہنمائی کرسکے۔ یوں سیاسی قدرت اور اجتماعی قدرت ایک دوسرے کے آمنے سامنے آجاتی ہیں۔ اجتماعی طاقت کے تین بنیادی ارکان یہ ہیں:

۱۔ لوگوں کی شراکت اور حمایت ۲۔ قیادت ۳۔ آئیڈیالوجی

۱۔ لوگوں کی شراکت اور حمایت

فرانس: سن ۱۷۶۳ سے ۱۷۷۰ کے درمیان بادشائے فرانس اور اسکی پارلمان کے درمیان بادشاہی اختیارات پر تنازعات شروع ہوئے، پارلمانی ممبران اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرنے لگے، دوسری طرف فرانس کا اقتصادی بحران شدت اختیار کرچکا تھا، لہذا بادشائے فرانس نے ان ممبران کو مجبوراً نظر انداز کیا۔ یوں نتیجتاً ایک کہ بعد ایک ممبران پارلمان نے استعفے دینا شروع کیے اور ایک نئے بحران نے جنم لیا۔ ان ممبران نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے شورشیں اور بغاوتیں شروع کیں۔ لہذا کہا جاسکتا ہے، کہ یہ انقلاب عوامی انقلاب نہیں تھا در حقیقت شاہ اور پارلیمانی ممبران کے ٹکراؤ سے شروع ہوا اور مالی بحران کی وجہ سے اس میں شدت آئی۔[۱]

۱۔ آلبر مالہ وژول ایزاک، تاریخ قرن ۱۸ و انقلابِ فرانس، ص ۳۷

روس: جیسا کہ بیان ہوا کہ روسی فوج کی پہ در پہ شکست کے بعد، فوجی مرال پست ہوچکا تھا اور یہ باعث بنا کہ حکومت اور فوج میں چپقلش شروع ہوئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ فوج کی ایک کثیر تعداد نے حکومت کے خلاف قیام کیا۔ دوسری طرف اقتصادی بحران کی وجہ سے کارخانوں میں کام کرنے والوں کو حقوق سے محروم کردیا گیا، یوں اس نظام کے خلاف تحریک میں مزید تیزی آئی، اور یہ تحریکیں انقلاب کی طرف بڑھنے لگیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرے کے تمام طبقات نے اس انقلاب میں شرکت نہیں کی تھی، اور یہ انقلاب خالصتاً عوامی انقلاب شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ایران: وہ چیز جو انقلاب اسلامی ایران کو دیگر تمام انقلاب سے ممتاز کرتی ہے وہ اس انقلاب کا خالصتاً عوامانہ ہونا ہے، جس میں معاشرے کے ہر طبقے اور خصوصاً پابرہنہ، مستضعفین، اور کمزور لوگوں نے بھرپور شرکت کی۔ اور اسکی بڑی وجہ اس انقلاب کا دین سے وابستگی ہے۔ یہ انقلاب اس جہت سے منفرد تھا کہ اس انقلاب نے خالصتاً دینی بنیادوں پر لوگوں کو متحرک کیا اور گھروں سے نکالا۔ شاہ ایران، سرزمین ایران کو مغربی طرز اور فرہنگ پر اُستوار کروانا چاہتا تھا اور یہی عوام اور شاہ کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہ بنا۔ اس کام کے لئے شاہ نے حجاب پر پابندی لگائی اور اپنی مخصوص پلیس کے ذریعے خواتین کو حجاب اتارنے پر مجبور کیا۔ اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات اور قرآنی تعلیمات کو ختم کروایا، علماء اور بزرگ مجتہدین کی حرمت کو پامال کیا، حتیٰ علمائے دین کو اپنا مخصوص لباس پہننے کی اجازت نہ تھی۔ اسی طرح برائی اور فساد کے مراکز اور شراب خانے مختلف علاقوں میں عام کروائے۔ پیشرفت اور ترقی کے نام پر ایک قوم کی ثقافت، فرہنگ اور اسلام سے وابستگی کو کمرنگ کرنے کی کوششیں کیں۔

یہ وہ مسائل تھے جو عام لوگوں کے لئے قابل قبول نہیں تھے کیونکہ ایرانی عوام اپنے دین و مذہب سے شدید عقیدت رکھتے تھے اور دینی مسائل میں کسی غیر کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے۔ اور اس قسم کی سیاست ایران جیسے معاشرے کے لئے قطعاً سازگار نہ تھی، نتیجتاً عوام نے بھرپور انداز سے اس شاہی نظام کے خلاف قیام کیا۔

۲۔ قیادت : قیادت اجتماعی طاقت کا ایک اور اہم رکن ہے، جو انقلاب کو مخصوص اصولوں پر گام زن رہنے میں مدد دیتی ہے اور اسی کے گرد تمام طبقات متحد ہوتے ہیں۔ قیادت کا ایک اہم ہدف انقلاب کو آئیڈیالوجی سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے اس کے خط پر رکھنا اور آگے لے کر بڑھنا ہوتا ہے۔ ایک قیادت کا بابصیرت ہونا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

فرانس : جیسا کہ بیان ہوا اس انقلاب میں عوامانہ شرکت اُس سطح کی نہیں تھی، اور یہ انقلاب مخصوص اشرافیہ نے ایک ضعیف حکومت کے خلاف برپا کیا اور اس میں کامیاب ہوئے۔ ان اشرافیہ میں اورلین ڈیوک (Duke Of Orleans) اور میرابو (Mirabeau) شامل ہیں۔

روس : چونکہ اس انقلاب میں اہم کردار فقط کارخانے کے ملازمین اور فوجی جانبازوں کا تھا لہذا ان کا کوئی مخصوص اور مشخص قائد نہیں تھا۔ یو نمختلف گروہ قیادت کے دعویدار بنے۔ البتہ مشہور یہ ہے کہ ''لینن'' (Lenin) کی تعلیمات سے بھرپور استفادہ کیا گیا تھا۔

ایران : اسلامی انقلاب میں اصل قیادت علماء اور روحانی پیشوایان کی تھی، ایران کے اسلامی انقلاب میں مرکزی قیادت آیت اللہ روح اللہ خمینیؒ نے سنبھالی تھی، اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ وہ واحد انقلاب تھا جس میں سیاسی قیادت کے لحاظ سے عوام کے اندر کوئی تنازعہ یا اختلاف موجود نہیں تھا اور سب کے سب ایک قیادت پر مُتفق تھے۔

امام خمینیؒ ایک سید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دینی مرجع اور مجتہد تھے۔ انقلاب کی تحریک کا آغاز انہوں انقلاب کی کامیابی سے ۱۵ سال قبل کیا تھا۔ حکومتِ شاہ نے کئی بار انہیں جلاوطن کیا اور بلاخر ۱۵ سال کی جلاوطنی کے بعد انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

۳۔ آئیڈیالوجی: فرانس : فرانسیسی انقلاب میں لبرل ازم (روشن فکری) کا رنگ بے حد نمایاں تھا۔ اور اس طرزِ تفکر میں دین کی تعریف یہ ہے کہ ''فقط خدا اور بندے کا انفرادی رابطہ''۔ یعنی انسان کی زندگی کا انفرادی شعبہ دین سے مربوط ہے، لیکن اجتماعی شعبہ مثلاً سیاست، اقتصاد، اجتماعی مسائل، تعلیم، ثقافت اور اسی طرح دیگر شعبوں میں دین کو حق

حاصل نہیں کہ اظہارِ نظر کرے۔

روس: سن ۱۹۱۷ میں بظاہر کسی خاص آئیڈیالوجی کا تصور دیکھنے میں نہیں آتا ، لیکن انقلاب کی کامیابی کے بعد اور حکومت کی تشکیل کے دوران روسی انقلاب کا ثمرہ لادینیت اور کمیونسٹ پارٹی کی صورت میں آتا ہے ، جو دین اور اور اسکے پیروکاروں کو معاشرے میں برداشت ہی نہیں کرسکتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ طبقہ روشن فکر اور لبرل طبقے سے بڑھ کر دین کا مخالف تھا۔

ایران: انقلابِ اسلامی ایران کی کامیابی میں جس چیز نے سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا وہ اسلامی نظریہ یا آئیڈیالوجی تھی۔ بیسویں صدی کے اواخر میں رونما ہونے والا یہ انقلاب ایک ایسے زمانے میں واقع ہوا جب نامور دانشور اس بات کو باور کر چکے تھے کہ

''انسان کی زندگی میں دین ایک افیون سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا کہ جسے استعمال کر کے انسان صرف مست ہو سکتا ہے۔ یہ انسان ہے جس نے دین کو ایجاد کیا ہے ، نہ یہ کہ دین نے انسان کو بنایا ہے۔''[۱]

اکثریت ایمان لا چکے تھے کہ دین اپنے اندر اتنی صلاحیت نہیں رکھتا کہ آج کے دور کے انسان کی ضرورتوں کو پورا کر سکے ، اور بشر کو زندگی گذرانے کے لئے ایک جامع اور کامل نظام فراہم کر سکے ، جو ایک طرف مقدس بھی ہو اور دوسری طرف عقلی اور منطقی اصولوں کے عین مطابق ہو اور تیسری طرف تجربات اور اجتہاد کا بھی منکر نہ ہو۔ مشرق و مغرب کے تقریباً تمام دانشور قطعِ نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، اس بات کا اعتراف کر چکے تھے کہ دین کے پاس آج کے انسان کے لئے ایک کامل اور جامع نظامِ زندگی موجود نہیں ہے۔ بیسویں صدی کو ٹیکنالوجی کی صدی کہا گیا اور یہ صدائیں بھی گوش و کنار سے سننے میں آئیں کہ آج کا انسان اپنے فکری بلوغ تک پہنچ چکا ہے مثلاً چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔ لہذا انسان اپنے فکری بلوغ کے بلبوطے پر اپنے لئے ، اپنے معاشرے کے لئے اور ساری دنیا کے لئے نظام وضع کر سکتا ہے۔ اور اسے اس کام کے لئے مقدس تعلیمات اور خدا کی ضرورت نہیں۔

۱۔ آندرہ پیتر، مارکس و مارکسیسم، ص ۲۶۲

اس تاریک ماحول میں جب بشر دین کی طرف سے بالکل ناامید ہوچکا تھا، ایسے میں انقلاب اسلامی کی صورت میں روشنی کی ایک کرن کُرہ ارض کے ایک ایسے خطے میں دیکھائی دیتی ہے جو کسی کہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ سخت سیاسی حالات اور ایک طاقتور شہنشاہی قدرت جس کی سیاسی طاقت کے چرچے دنیائے سیاست میں مشہور ہوں، اس کا تختہ پلٹ کر انقلاب اسلامی نمودار ہوتا ہے۔ وہ چیز جو اس انقلاب کو دوسرے انقلاب سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے، یا جو چیز دوسرے انقلاب میں دور دور تک دیکھائی نہیں دیتی وہ اس انقلاب کا دینی بنیادوں پر استوار ہونا ہے۔ اس بات کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ شرکائے انقلاب کے مطالبات اور شعاریہ نہیں تھے کہ حکومت روٹی، کپڑا اور مکان سستا کرے اور فقط لوگوں کی مادّی ضروریات فراہم کی جائیں۔ اگرچہ انہیں ان تمام چیزوں کی حاجت تھی لیکن انقلابیوں کے مطالبات یہ تھے کہ ہمیں ایک ایسی سرزمین چاہیئے جہاں اسلام حکومت کرے، اسلامی قوانین کا نفاذ معاشرے پر ہو، اسلامی اقدار کی بالادستی ہو، طبقاتی نظام میں امیر اور غریب کا فرق ختم کیا جائے۔ ایسے نظام سے چھٹکارا ملے جہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ جہاں شرک و کفر و طاغوتی طاقتیں ذلت کے ساتھ ہمارے ملک سے باہر جائیں۔ ہمیں ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جہاں قرآن وسنت کے دیئے ہوئے اصول ہماری راہنمائی کریں، ہمیں ایسی اسلامی حکومت کی ضرورت ہے جو دین و دنیا دونوں میں ہمارے لئے سعادت کا باعث بنے۔

انقلابِ اسلامی کے نظریے اور آئیڈیالوجی کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان کسی صورت ظلم کے مقابلے میں خاموش نہیں رہیں گے، یہ نظریہ ایسے حکمرانوں کو بھی برداشت نہیں کرتا جو استعماری اور سامراجی طاقتوں کے مفادات کی چوکیداری کریں۔ اس نظریہ کا شعاریہ ہے کہ تمام مسلمان (قطع نظر اس سے کہ وہ شیعہ، سنی، بریلوی، جنفی، دیوبندی یا کسی دوسرے فرقے سے تعلق رکھتے ہوں) سب آپس میں بھائی ہیں اور سب کے سب ایک جسم کے مختلف اعضاء ہیں، کہ اگر جسم کا ایک حصہ بے چین ہو تمام اعضاء بے چین ہوجاتے ہیں۔ اس نظریے کے پیروکاروں کا فریضہ یہ ہے کہ استعماری دشمن جو مسلمانوں

کی سرزمین اور انکے قدرتی، مالی اور جانی وسائل پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور تمام ملت اسلامیہ کو غلام بنائے ہوئے ہیں، انکے مقابلے میں صف آراء ہوں اور ان کی نابودی کے لئے کوششیں کریں، اور استعماری حکومتوں کے نوکروں اور چوکیداروں کو اپنے ملک سے باہر نکالیں۔ درحقیقت اسلامی آئیڈیالوجی یا اسلامی نظریہ میں اتنی طاقت موجود ہے کہ جو انسان کو تمام تر دشوار حالات کے باوجود استقامت اور ڈٹے رہنے میں مدد دیتی ہے۔ ایک نظریاتی انسان جو درست اسلامی آئیڈیالوجی سے سرشار ہو، اس کے عزم و ارادے ایسی فولادی دیوار کی طرح ہوتے ہیں، جسے طاقتور ہتھیار، اور کسی ایٹم بم سے بھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اور آج ہم اس کا عملی نمونہ دیکھ سکتے ہیں۔ اور یہی انقلاب اسلامی ایران کی کامیابی کے رموز ہیں۔ اسی ارادی قوت کے بارے میں ایک شاعر کے بقول:

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
طوفانی خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

نتیجہ:: ہم نے ثابت کیا کہ فرانسیسی اور روسی انقلاب میں جو چیز انقلاب کی کامیابی کا پیش خیمہ بنی وہ برسرِ اقتدار حکومتوں کی ضعیف سیاسی قدرت تھی۔ اور ان دونوں انقلاب کی کامیابی میں بنیادی کردار بعض اشرافیہ طبقوں اور فوجی افسروں کا تھا، یعنی عوام سے اس انقلاب کا بلا واسط کوئی تعلق نہیں تھا، البتہ عوام کے بعض طبقات نے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان تحریکوں میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن انقلاب اسلامی ایران میں ہم نے ثابت کیا کہ برسرِ اقتدار شاہی حکومت کی سیاسی قدرت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھی، لیکن اسکے باوجود اجتماعی طاقت یعنی وہی اسلامی آئیڈیالوجی نے اس انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور بغیر کسی اسلحہ کے سیاسی قدرت پر غلبہ پالیا۔ حقیر کے نزدیک آنے والے محققین کو آئندہ تحقیق کے لئے جس موضوع کو زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ کیسے استعماری طاقتیں ایک آئیڈیالوجی کی طاقت سے سرشار انقلاب کو دوسری قوم کے لئے نمونہ عمل بننے سے روکتی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں کیسے ایک اسلامی انقلاب کو دوسری سرزمینوں پر پھلنے پھولنے سے روکا جاتا ہے اور اسے دوسری ملتوں کے لئے ناقابلِ عمل بنایا جاتا ہے۔

منابع

۱۔ جانسون، چالمرز، تحول انقلابی: بررسی نظری پدیده انقلاب، ترجمہ حمید الیاسی، تہران، امیر کبیر، ۱۳۶۳

۲۔ محمدی، منوچھر، انقلاب اسلامی در مقایسہ با انقلاب روسیہ و فرانس، قم، دفتر نشر معارف، ۱۳۹۱

۳۔ مطہری، مرتضیٰ، پیرامون انقلاب اسلامی، قم، دفتر انتشارات اسلامی، ۱۳۵۹

۴۔ کلنل والتر، تاریخ روسیہ از پیدایش تا ۱۹۴۵، ترجمہ نجف قلی معنوی، تہران، انتشارات کیسیون معارف، ۱۳۳۸

۵۔ مالہ، آلبر، وژول ایزاک، تاریخ قرن ھیجدھم، وانقلابِ کبیر فرانس، ترجمہ: رشید یاسمی، تہران، سپہر، ۱۳۶۴

۶۔ بریتون، کرین، کالبد شکافی چھار انقلاب، ترجمہ: محسن ثلاثی، تہران، نشر نو، ۱۳۶۲

۷۔ مطہری، مرتضی، خدمات متقابل ایران و اسلام، قم، صدرا، ۱۳۵۷

۸۔ کالیستوف، د۔ پ۔، و دیگران، تاریخ روسیہ شوروی، دو جلد، ترجمہ: حشمت اللہ کامرانی، تہران، بیگوند، ۱۳۶۱

۹۔ دینکین، ژنرال، تاریخ طغیانھای روسیہ، بی جا، بی نا، بی تا

۱۰۔ طاھری خرم آبادی، حسن، ولایت فقیہ و حاکمیت ملت، قم، دفتر انتشارات اسلامی، ۱۳۶۲

۱۱۔ پیتر، آندرہ، مارکس و مارکسیسم، ترجمہ شجاع الدین ضیائیان، تہران، دانشگاہ تہران، ۱۳۵۸

انگریزی منابع:

History Of Russian Soviet Union By Kalistov And Others

ویب سائٹ منابع:

Http://Urduseek.com/Dictionary/Revolution

Https://Www.almaany.com

قرآن وسنت کی روشنی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات

موسی خان

خلاصہ:

قرآن کریم ایک ایسی کتاب ہے جو جسے خداوند متعال نے اپنے رسول کے قلب پر نازل کیا تاکہ پیغمبر اکرم ص نیک عمل کرنے والوں کو جنت کی بشارت دیں اور برے کام کرنے والوں کو عذاب الہی سے ڈرا سکیں ۔ زمین، آسمان اور ان میں موجود تمام چیزوں کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ انسان ان نعمتوں کا فائدہ اٹھا کر اپنی دنیا اور آخرت سنواردیں۔ انسان ایک جسمانی مخلوق ہونے کے ناطے جسمانی ضرورتوں کا حامل ہے وہ زمین پر ایک خاص محدودیت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اس لئے انسان سب سے پہلے مادی ضرورتوں سے روبروہوتا ہے، مادی ضرورتیں اگر پوری نہ ہوجائیں تو انسانی وجود خطرے میں پڑسکتا ہے جیسے مناسب غذا ، مناسب کپڑا اور مناسب مکان وغیرہ ۔ اسلام انسان کی مادی زندگی کے لئے کسب معاش اور کسب و کار کا اہتمام کرتا ہے اور لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جو حیات انسان کو جاری رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس مقالہ میں قرآن و سنت کی روشنی میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کو اجمالی طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

بنیادی الفاظ: قرآن کریم ، سنت ، انسان ، فردی ، اجتماعی ، ضروریات ۔

مقدمہ :

انسان کی مادی ضرورتوں کے بارے میں جاننا تمام انسانوں کے لئے ضروری ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں خداوند متعال نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا، اور پانی ہر جانداز چیز کی حیات کا ضامن ہے۔ جیسے کہ خداوند متعال اپنی لاریب کتاب میں ارشاد فرماتا ہے : جوہر حیات اور اس کے آثار سے لذت حاصل کرنے کے لئے قوت اور طاقت کی ضرورت ہے اور قوت کے بغیر زندگی کی بقا ممکن نہیں ہے۔ اس نگاہ سے روٹی اور دوسری اشیائے خوردو نوش کا مزہ صرف کھانے اور زیادہ استعمال میں نہیں ہے بلکہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی فرامین کی روشنی میں مزہ، قوت کے حصول، عمل کی طاقت، چست وچالاک رہنے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں کوشش کرنے کا نام ہے جیسا کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں : (طَعْمُ الْمَاءِ الْحَيَاةُ وَطَعْمُ الْخُبْزِ الْقُوَّة)[1] پانی زندگی کا مزہ ہے اور روٹی قوت کا مزہ ہے۔

ہر جاندار کی زندگی کیلئے غذا کی اشد ضرورت ہے، اور خدا نے جتنی بھی مخلوقات بنائی ہے وہ سب ہمیشہ اس جہان فانی میں رہنے نہیں آئے ہیں، وہ زندہ رہنے کے لیے کھانا کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں کہ اسی لئے انسانی زندگی پر مادی اثرات مرتب ہوتے ہے۔ مادیات کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اس لئے انسان مادیات کو حاصل کرنے کے لئے سعی و محنت کرتے ہیں۔

اسلام انسانی جسم اور اُس میں موجود روح کے ارتقاء اور تکامل کے لئے ہدایت فراہم کرتا ہے اور انسانی جسم کی توہین شخصیت کی توہین ہے۔ اگر کوئی اس گناہ کا مرتکب ہو تو وہ سزا کا حقدار ہے۔ اسلام جسمانی صحت و سلامتی کے لئے ایک خاص اہمیت کا قائل ہے۔ ایک طرف سے ورزش اور تمرین کا انسان کی سلامتی کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔ دینی تعلیمات میں جسم کی سلامتی کا خیال رکھنے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے : (وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ

۱۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار علیہم السلام، جلد ۷۵، صفحہ ۲۵۴ وحدیث : ۲۶۹۷۰

اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ)[1] اوران کے پیغمبر نے ان سے کہا : اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے ،کہنے لگے : اسے ہم پر بادشاہی کرنے کا حق کیسے مل گیا؟
جب کہ ہم خود بادشاہی کے اس سے زیادہ حقدار ہیں اور وہ کوئی دولتمند آدمی تو نہیں ہے ، پیغمبر نے فرمایا : اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت کی فراوانی سے نوازا ہے اور اللہ اپنی بادشاہی جسے چاہے ۔
انسان کے حقیقی وجود کو اس کا روحانی اور معنوی پہلو مرتب کرتا ہے ، لیکن اگر انسان خود کو غیر سمجھے گا تو ظاہر ہے کہ اس نے دوسرے فرد کے وجود کو اپنا وجود سمجھا ہے ۔ قرآن کے اعتبار سے بعض خود فراموش افراد ہمیشہ اپنی حقیقی جگہ ، حیوانیت کو بٹھاتے ہیں اور جب حیوانیت انسانیت کی جگہ قرار پاجائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ جو بھی ہے یہی جسم اور مادی نعمتیں ہیں ، تو ایسی صورت میں انسان مادی جسم اور حیوانی خواہشات کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس کی دنیا بھی مادی دنیا کے علاوہ کچھ نہیں ہے ، ایسے حالات میں خود فراموش انسان کہے گا ، کہ : (وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً)[2] میں گمان نہیں کرتا تھا کہ قیامت بھی ہے اور کہے گا کہ : (مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ)[3] ہماری زندگی تو بس دنیا ہی ہے ، مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو تو بس زمانہ ہی مارتا ہے
انسان کی فردی ضرورتیں: قرآن مجید اور سنت میں انسان کی فردی ضروریات کو جابجا ایک خاص انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔
۱۔ آب و غذا: خداوند متعال نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا ، اور پانی ہر جاندار چیز کی حیات کا ضامن ہے ۔ اور پانی کے بغیر جاندار کی بقاء کو حاصل ہے ۔ جیسے کہ خداوند متعال اپنی لاریب کتاب میں ارشاد فرماتا ہے : وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اور ہر جاندار کو پانی سے قرار دیا ہے ۔ » جوہر حیات اور اس کے آثار سے لذت حاصل کرنے کے لئے قوت اور طاقت کی ضرورت ہے اور قوت کے بغیر زندگی کی بقا ممکن نہیں ہے ۔ اس نگاہ سے روٹی اور دوسری اشیائے خورد و نوش کا مزہ صرف کھانے اور زیادہ استعمال میں نہیں ہے بلکہ ائمہ معصومین کی فرمایشات کی روشنی میں مزہ ، قوت کے حصول ، عمل کی طاقت ، چست و چالاک رہنے اور زندگی کے مختلف میدانوں میں کوشش کرنے کا نام ہے ۔

۱۔ سورہ بقرہ ۲ : آیہ ۲۴۷
۲۔ کھف ۱۸ : آیہ ۳۶
۳۔ جاشیہ ۴۵ : آیہ ۲۴

جیسا کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: طَعْمُ الْمَاءِ الْحَيَاةُ وَ طَعْمُ الْخُبْزِ الْقُوَّةُ [۱]
پانی زندگی کا مزہ ہے اور روٹی قوت کا۔"
ہر جاندار کی زندگی کیلئے غذا کی اشد ضرورت ہے، اور خدا نے جتنی بھی مخلوق بنائی ہے وہ سب ہمیشہ اس جہان فانی میں رہنے نہیں آئے، اور زندہ رہنے کے لیے کھانا کھاتے ہیں۔
(وَ مَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَداً لاَ يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوا خَالِدِينَ) [۲] اور ہم نے ان لوگوں کے لئے بھی کوئی ایسا جسم نہیں بنایا تھا جو کھانا نہ کھاتا ہو اور وہ بھی ہمیشہ رہنے والے نہیں تھے۔ "وَ هُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْماً طَرِيّاً "اور وہی وہ ہے جس نے سمندروں کو مسخر دیا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھا سکو۔"
(وَ أَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَ لَحْمٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ) [۳] اور ہم جس طرح کے میوے یا گوشت وہ چاہیں گے اس سے بڑھ کر ان کی امداد کریں گے۔ "فلولا الخبز ما صلّينا و لاصمنا و لاادّينا فرائض ربّنا عزّوجل
"اگر روٹی نہ ہوتی تو ہم نہ نماز پڑھتے نہ روزہ رکھتے اور نہ اپنے پروردگار کے واجبات کو انجام دیتے۔ "وَ اعْلَمْ يَا مُفَضَّلُ أَنَّ رَأْسَ مَعَاشِ الْإِنْسَانِ وَ حَيَاتِهِ الْخُبْزُ [۴]
"اے مفضل جان لو کہ! انسان کی زندگی کا اساسی سرمایہ روٹی اور پانی ہے۔"
اللَّحْمُ مِنَ اللَّحْمِ مَنْ تَرَكَهُ أَرْبَعِينَ يَوْماً سَاءَ خُلُقُهُ كُلُوهُ فَإِنَّهُ يَزِيدُ فِي السَّمْعِ وَ الْبَصَرِ [۵] "گوشت گوشت سے ہے اگر کوئی چالیس دن کے لئے گوشت کو ترک کرے تو اس کے اخلاق برے ہوجائیں گے۔ گوشت کھائیں کہ یہ قوت سماعت اور بصارت کو بڑھا دے گا۔ "اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْوَاسِعِ الْفَاضِلِ الْمُفْضِلِ رِزْقاً وَاسِعاً حَلَالاً طَيِّباً بَلَاغاً لِلْآخِرَةِ وَ الدُّنْيَا هَنِيئاً مَرِيئاً [۶] "پروردگارا! میں تیری رحمت واسعہ اور فضل واسع کے واسطے سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے رزق حلال جو دنیا و آخرت دونوں کے لئے پاک و منزہ ہو عنایت کرے۔"

۱۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار علیہم السلام، جلد ۷۵، صفحہ ۲۵۴ و حدیث: ۲۶۹۷۹۰
۲۔ انبیاء ۲۱: آیہ ۸
۳۔ طور ۵۲: آیہ ۲۲
۴۔ بحار الأنوار، جلد ۳، صفحہ ۸۶، حدیث: ۲۲۲۶۱۴
۵۔ بحار الأنوار، جلد ۶۳، صفحہ ۶۶، حدیث: ۲۵۶۹۲۱
۶۔ بحار الأنوار، جلد ۸۳، صفحہ ۱۴۳، حدیث: ۲۷۵۹۱۵

۲۔ لباس کی ضرورت : عَنْ إِسْحَاقَ بْنِ عَمَّارٍ قَالَ : سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللَّهِ ع عَنِ الرَّجُلِ يَكُونُ لَهُ عَشَرَةُ أَقْمِصَةٍ يُرَاوِحُ بَيْنَهَا قَالَ لَا بَأْسَ [۱] اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ وہ آدمی جس کے پاس دس کپڑے ہیں کیا ان کو یکی بعد دیگری پہن سکتا ہے ؟ تو امام علیہ السلام نے جواب دیا ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ۔

حضرت علی علیہ السلام ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں : (مَا أَصْبَحَ بِالْكُوفَةِ أَحَدٌ إِلَّا نَاعِماً إِنَّ أَدْنَاهُمْ مَنْزِلَةً لَيَأْكُلُ الْبُرَّ وَ يَجْلِسُ فِي الظِّلِّ وَ يَشْرَبُ مِنْ مَاءِ الْفُرَاتِ) [۲] "کوفہ والوں کی حالت ٹھیک ہے سب سے کم حیثیت والا انسان بھی گندم کی روٹی کھاتا ہے اس کا اپنا گھر ہے اور آب گوارا سے محظوظ ہوتا ہے ۔"

لباس کی اہمیت میں خداوند متعال قرآن کریم میں بنی آدم سے مخاطب ہو کر ارشاد فرماتا ہے : (يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاساً يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَ رِيشاً وَ لِبَاسُ التَّقْوَى ذلِكَ خَيْرٌ ذلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ) [۳] "اے اولادُ آدم ہم نے تمہارے لئے لباس نازل کیا ہے جس سے اپنی شرمگاہوں کا پردہ کرو اور زینت کا لباس بھی دیا ہے لیکن تقوی کا لباس سب سے بہتر ہے یہ بات آیات الٰہیہ میں ہے کہ شاید وہ لوگ عبرت حاصل کر سکیں ۔"

اور مزید فرمایا : (وَ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيلَ تَقِيكُمْ بَأْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُونَ) [۴] "اور اللہ ہی نے تمہارے لئے ایسے پیراہن بنائے ہیں جو گرمی سے بچا سکیں اور پھر ایسے پیراہن بنائے ہیں جو ہتھیاروں کی زد سے بچا سکیں. وہ اسی طرح اپنی نعمتوں کو تمہارے اوپر تمام کر دیتا ہے کہ شاید تم اطاعت گزار بن جاؤ ۔"

اسلام زندگی کا دین ہے اور زندگی کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا ہے زندگی کے تمام پہلوؤں کو ایک جامع نظر سے دیکھتا ہے اور ہر پہلو کے لئے ایک خاص حکم صادر کرتا ہے ۔ اسلام مادی ضرورتوں کو ایک مقدمہ کے عنوان سے دیکھتا ہے کہ یہ ضرورتیں معنویت اور روحانیت کی طرف سفر کرنے والی شاہراہ پر چلنے کے لئے لازم ہیں ۔

۱۔ الکافی, جلد۶, صفحہ ۴۴۳، حدیث : ۱۱۶۳۳۵

۲۔ المناقب, جلد۲, صفحہ ۹۹، حدیث : ۳۷۷۱۶۱

۳۔ اعراف۷ : آیہ ۲۶

۴۔ نحل۱۶ : آیہ ۸۱

کتب حدیث اور منابع روائی میں اس بارے میں کئی ابواب ذکر ہوئے ہیں، مثلاً
۱۔ مرحوم کلینی کتاب مستطاب کافی میں ایک باب (الزی و التجمل و المروۃ) خوبصورتی اور مروت کے بارے میں لکھے م ہیں اور اس باب کے ذیل میں کئی اور ابواب کو بھی جمع کرتے ہیں ان میں سے تجمل اور اظہار نعمت، باب لباس، باب سواد اور وسمہ، باب سرمہ، باب حمام اور باب خوشبو نامی ابواب میں زیبائی اور خوبصورتی کے بارے میں احادیث کا تذکرہ کرتے ہیں۔
۲۔ شیخ رضی الدین طبرسی نے اپنی مکارم الاخلاق نامی کتاب کو بھی اسی عنوان کے ساتھ مختص کیا ہے اور اس کے ابواب کو اس طرح بنایا ہے: باب آداب التنظیف و التطیف و التکحل و التدھن و السواك (صفائی کرنے، خوشبو لگانے، سرمہ لگانے، سر میں تیل لگانے اور مسواک کرنے کے آداب)
۳۔ علامہ مجلسی نے بحار الانوار کا پورا ایک جلد اسی عنوان کے لئے مختص کیا ہے اور باب التجمل و لبس الثیاب الفاخرۃ و النظیفۃ (تجمل اور صاف ستھرا لباس زیب تن کرنا) وغیرہ
۴۔ علامہ فیض کاشانی نے بھی کتاب الوافی کی بیسویں جلد میں ایک باب (ملابس و تجملات) کو اسی عنوان کے ساتھ مختص کیا ہے۔
۵۔ شیخ حر عاملی نے وسائل الشیعہ ج سوم میں پورے تہتر ابواب کو اسی عنوان کے ساتھ مختص کیا ہے۔
۶۔ مرحوم میرزا حسین نوری نے بھی کتاب مستطاب مستدرک الوسائل کی پہلی جلد میں کئی ابواب اسی عنوان کے ساتھ مختص کیا ہے۔
فلسفہ لباس: لباس زندگی کی ضروریات میں سے ہے یہ لباس کبھی واجب ہے جیسے مردوں کے لئے ستر عورت اور خواتین کے تمام بدن کا ڈھانپنا اور اخلاقی پہلو کا حامل ہے جیسے واجب کے علاوہ باقی لباس، اس کے علاوہ لباس ظاہری خوبصورتی کا بھی باعث ہے اور مومنین کے لئے سزاوار ہے کہ وہ سج دھج کر معاشرے میں زندگی کریں۔

اب یہ کہ لباس کس طرح کا ہونا چاہیئے یہ تو ان کی جیب پر منحصر ہے۔ اگر نادار ہوں تو صرف ضرورت کی حد پر اکتفاء کریں اگر دولت مند ہوں تو اچھا لباس زیب تن کریں اور مولا کا متقین کی توصیف میں فرمانا کہ "و ملبسھم الاقتصاد" یعنی متقین کا لباس بھی میانہ ہے اس مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ متعدد لباس کا ہونا خود ایک قسم کی میانہ روی ہے اور بنیادی طور پر لباس انسان کی سماجی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۳۔ آرائش کی ضرورت:

انسانی زندگی کے تقاضوں میں سے ایک تقاضا زینت اور آرائش بھی ہے جن کا تعلق اگر چہ انسان کے بدن اور اشیاء کے ظاہری حصے سے ہے لیکن فلسفہ زینت اس سے کہیں بڑھ کر انسان کی روح اور جان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے ائمہ علیہم السلام کی پاک سیرت میں یہ بھی نظر آتا ہے یہ ہستیاں گھر کے اندر تو سخت اور موٹے کپڑے پہنتی تھیں تاکہ کہیں ناداروں اور فقیروں سے دور نہ جائیں لیکن جب لوگوں میں نمایاں ہوتی تھیں، توسج دھج کر بہترین کیفیت میں تشریف لاتی تھیں۔ جب آنکھیں، دل اور جان حضرت انسان کی طرف متوجہ ہوں اور ظاہری طور پر آراستہ، تمیز، منظم اور موزون ہو تو اسے دیکھ کر لوگ خوش ہوجاتے ہیں، اور ایک کامل مومن کی شکل میں ظاہر ہوجاتا ہے کہ چہرہ حشاش بشاش لباس صاف ستھرا، چال چلن زیبا اور ایک دوسرے سے ملتے ہوئے خوش اخلاق ہوتا ہے۔ لیکن اگر چہرہ ابر آلود، گیسوئیں غبار آلود اور بات کرتے ہوئے غصہ اور ناراضگی کے عالم میں بات کرتا ہو تو لوگوں کا اس دل اٹھ جاتا ہے اور ایک منفی تاثیر دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ اسی لئے خود کو سجانا اور ظاہری طور پر خود کو خوبصورت بنانا سماجی حقوق میں سے ہے۔ ہر ایک کے لئے ضروری ہے کہ اس حق کی رعایت کرے۔ یہ سجنا سجانا ایک مرد کا اپنی بیوی کے سامنے اور ایک عورت کا اپنے شوہر کے سامنے زیادہ اہمیت کا حامل ہے دین مقدس میں اس کی بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔

میاں بیوی جب ایک دوسرے کے لئے خود کو آراستہ کرتے ہیں تو مرد کے لئے زیبا ترین زن اپنی بیوی ہے اور عورت کے لئے زیبا ترین مرد اپنا شوہر ہے لیکن اس کے برعکس اگر عورت اپنے شوہر کے لئے خود کو زیبا نہ کرے یا مرد اپنی بیوی کی خاطر خود کو آراستہ نہ کرے تو بسا اوقات دامن عفت بھی چھوٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امام علی علیہ السلام فرماتے تھے: (لِيَتَزَيَّنْ أَحَدُكُمْ لِأَخِيهِ الْمُسْلِمِ، كَمَا يَتَزَيَّنُ لِلْغَرِيبِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يَرَاهُ فِي أَحْسَنِ الْهَيْئَةِ)[1] "اپنے مومن بھائی کی خاطر اس طرح خود کو سجائیں کہ جس طرح وہ غیرں کے لئے خود کو آراستہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ غیر اسے بہترین شکل میں دیکھے۔"

قرآن مجید میں اس کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے، جیسے: (قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَ الطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ)[2] "پیغمبر! آپ پوچھئے کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کر دیا ہے اور بتائیے کہ یہ چیزیں روزِ قیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں. ہم اسی طرح صاحبان علم کے لئے مفصل آیات بیان کرتے ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت پاک میں آیا ہے کہ وہ اپنے بالوں کو رنگ کرتے تھے اور اسے اجر اور ثواب کا وسیلہ قرار دیتے تھے: (عَنْ ذَرْوَانَ الْمَدَائِنِيِّ قَالَ دَخَلْتُ عَلَى أَبِي الْحَسَنِ الثَّانِي ع فَإِذَا هُوَ قَدِ اخْتَضَبَ فَقُلْتُ جُعِلْتُ فِدَاكَ قَدِ اخْتَضَبْتَ فَقَالَ نَعَمْ إِنَّ فِي الْخِضَابِ لَأَجْراً أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ التَّهْيِئَةَ تَزِيدُ فِي عِفَّةِ النِّسَاءِ أَيَسُرُّكَ أَنَّكَ إِذَا دَخَلْتَ عَلَى أَهْلِكَ فَرَأَيْتَهَا عَلَى مِثْلِ مَا تَرَاكَ عَلَيْهِ إِذَا لَمْ تَكُنْ عَلَى تَهْيِئَةٍ؟ قُلْتُ لَا قَالَ هُوَ ذَاكَ قَالَ وَ لَقَدْ كَانَ لِسُلَيْمَانَ ع أَلْفُ امْرَأَةٍ فِي قَصْرٍ ثَلَاثُمِائَةٍ مَهِيرَةٌ وَ سَبْعُمِائَةٍ سُرِّيَّةٌ وَ كَانَ يُطِيفُ بِهِنَّ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ)[3]

۱۔ الخصال: ۶۱۲/۱۰۔

۲۔ اعراف ۷: آیہ ۳۲

۳۔ تفصیل وسائل الشیعۃ الی تحصیل مسائل الشریعۃ، جلد ۲۰، صفحہ ۲۴۶، حدیث: ۱۸۵۸۵۹

"ذروان مدائنی نقل کرتے ہیں کہ میں ایک دن امام ہادی علیہ السلام کی خدمت اقدس میں شرفیاب ہوا، دیکھا کہ آپ نے ابھی خضاب کیا ہے۔ میں نے عرض کیا: میری جان آپ پر قربان! خضاب کئے ہیں؟ تو امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں خضاب کے لئے بہت زیادہ اجر و ثواب ہے۔ کیا تم نہیں جانتے ہیں کہ مرد کا خود کو آراستہ کرنا عورت کی عفت اور پاکدامنی میں اضافہ کا باعث بنتا ہے (جب مرد خود کو آراستہ کرتا ہے تو اس کی بیوی دوسروں کی طرف رغبت نہیں کرے گی) کیا تم پسند کرو گے کہ جب گھر لوٹو تو اپنی بیوی کو غبار آلود اور بری شکل میں دیکھو؟ میں نے عرض کیا: نہیں یا بن رسول اللہ۔ اس وقت امام علیہ السلام نے فرمایا تمہاری بیوی بھی اسی طرح ہے۔ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے ایک ہزار عورتیں تھیں کہ ان میں تین سو بیویاں اور سات سو کنیزیں تھیں اور آپ ہر شب روز ایک کے پاس جاتے تھے۔"

اسی طرح ان ہستیوں کی سیرت میں ہے وہ زیبا اور خوبصورت کپڑے (لوگوں کے لئے) اور اس کے اندر سخت اور موٹے اونی کپڑے (خدا کے لئے) پہنتے تھے: (وَقَالَ سُفْيَانُ دَخَلْتُ عَلَى جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ وَعَلَيْهِ جُبَّةُ خَزٍّ دَكْنَاءُ وَكِسَاءُ خَزٍّ فَجَعَلْتُ أَنْظُرُ إِلَيْهِ تَعَجُّباً فَقَالَ لِي يَا ثَوْرِيُّ مَا لَكَ تَنْظُرُ إِلَيْنَا لَعَلَّكَ تَعْجَبُ مِمَّا تَرَى فَقُلْتُ لَهُ يَا ابْنَ رَسُولِ اللَّهِ لَيْسَ هَذَا مِنْ لِبَاسِكَ وَلَا لِبَاسِ آبَائِكَ قَالَ يَا ثَوْرِيُّ كَانَ ذَلِكَ زَمَانَ إِقْتَارٍ وَافْتِقَارٍ وَكَانُوا يَعْمَلُونَ عَلَى قَدْرِ إِقْتَارِهِ وَافْتِقَارِهِ وَهَذَا زَمَانٌ قَدْ أَسْبَلَ كُلُّ شَيْءٍ عَزَالِيَهُ ثُمَّ حَسَرَ رُدْنَ جُبَّتِهِ فَإِذَا تَحْتَهَا جُبَّةُ صُوفٍ بَيْضَاءُ يُقَصِّرُ الذَّيْلَ عَنِ الذَّيْلِ وَالرُّدْنَ عَنِ الرُّدْنِ وَقَالَ يَا ثَوْرِيُّ لَبِسْنَا هَذَا لِلَّهِ تَعَالَى وَهَذَا لَكُمْ فَمَا كَانَ لِلَّهِ أَخْفَيْنَاهُ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَبْدَيْنَاهُ)[1]

"سفیان ثوری نقل کرتا ہے کہ میں امام صادق علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ آپ علیہ السلام نے ایک ایسا خوبصورت کپڑا (جُبَّةُ خَزٍّ دَكْنَاءُ) زیب تن کیا ہوا تھا

۱۔ لعزالی: جمع عزلاء وہی مصب الروایۃ فقولہ: قدأسبل کل شئ عزالیہ، یریدبہ وفور الخیر وانتشار البرکۃ وکثرۃ النعم و تفشی الرخاء۔

جو گہرا سیاہ مائل بہ سرخی تھا، میں تعجب کے ساتھ آنحضرت علیہ السلام کا نظارا کر رہا تھا، اس وقت آپ علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا: اے ثوری! تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تعجب کے ساتھ مجھے دیکھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: یا بن رسول اللہ یہ آپ اور آپ کے آبا و اجداد کے لباسوں میں سے تو نہیں تھا! امام علیہ السلام نے فرمایا: اے ثوری! اس زمانے میں ہر طرف فقر و تنگدستی کا دور دورا تھا لوگ زیادہ تر فقیر تھے تو میرے آبا و اجداد اسی زمانے کے مطابق عمل کرتے تھے لیکن اب وہ زمانہ نہیں ہے نعمتوں کی فراوانی ہے۔ اس وقت آپ علیہ السلام نے اپنے آستین مبارک کو اوپر کیا تو میں نے دیکھا کہ ایک اونی کپڑا اس کے اندر ہے جس کے آستینیں کوتاہ دامن بھی کوتاہ ہے، اس وقت فرمایا: اے ثوری! یہ ہمارا لباس ہے جو خدا کے لئے پہنتے ہیں اور اوپر والا لباس تم لوگوں کے لئے پہنتا ہوں، جو خدا کے لئے ہے اسے مخفی کرتے ہیں جو تم لوگوں کے لئے ہے اسے ظاہر کرتا ہوں۔"

قرآن کریم بھی انسانوں کو زینتوں اور زیورات سے فائدہ اٹھانے کی طرف دعوت دے رہا ہے اور خدا کی طیبات کو خود پر حرام قرار دینے سے سختی سے منع کر رہا ہے: (قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً)[1] "کہہ دیجیے: اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق کو کس نے حرام کیا؟ کہہ دیجیے: یہ چیزیں دنیاوی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں۔"

اسی طرح عبادت کے وقت پھولوں کی خوشبو سے استفادہ کرنا، گھر والوں کے رہتے ہوئے خود کو خوشبو لگانا، گھر سے باہر جاتے ہوئے خود کو معطر کرنا بھی ایک سماجی، اخلاقی اور انسانی حق ہے یہ دینداری اور خوش اخلاق کی علامت بھی ہے؛ چونکہ زندگی محبتوں اور الفتوں کی بنیاد پر قائم ہے اور ایک فعال انسان سماج کی آبرو ہے اس کے لئے تمام مادی اور معنوی اوصاف سے متصف ہونے کی ضرورت ہے تاکہ سماجی تعلقات اور ایمانی رشتوں میں ایک مثالی انسان بن سکے اس لئے خوشبو لگانے کو پیغمبروں کے اخلاق میں سے شمار کیا گیا ہے۔

۱۔ اعراف، ۷: آیہ ۳۲

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت پاک میں آیا ہے کہ آپ سفر میں عطر سے غفلت نہیں کرتے تھے اسی طرح امام صادق علیہ السلام کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ مسجد میں آپ کی جگہ کو آپ کی خوشبو اور جائے سجدہ سے پہچانا جاتا تھا۔

۴۔ گھر کی ضرورت

ایک انسان کے لیے اُس کی پناہ گاہ کا ہونا بہت ہی ضروری ہے ،جس میں وہ اپنی ضروریات کی اشیاء کو محفوظ کر سکیں اور رات بسر کر سکے۔ اگر ایک انسان گھر نہ بنائے تو اُس کے لیے اُس کی اپنی زندگی تنگ ہو جائے گی۔ وہ جب رات کو سوئے گا تو وحشی درندوں کا خوف لے کر سوئے گا۔ اس لیے خداوند متعال نے انسانوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ :(وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَناً وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ جُلُودِ الْأَنْعَامِ بُيُوتاً تَسْتَخِفُّونَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ)[۱] "اور اللہ ہی نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو وجہ سکون بنایا ہے اور تمہارے لئے جانوروں کی کھالوں سے ایسے گھر بنا دئے ہیں جن کو تم روزِ سفر بھی ہلکا سمجھتے ہو اور روزِ اقامت بھی ہلکا محسوس کرتے ہو۔"

مکان اور رہنے کی جگہ بھی انسانی کی بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ ایک معاشرہ میں تمام افراد کے لئے مکان کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ امام علی علیہ السلام کے دارالحکومت شہر کوفہ میں امام علیہ السلام کی تدبیر اور عدالت کی وجہ سے سب کے سب مکان والے تھے۔ بعض روایات میں مکان کی وسعت اور گشادگی کو اہمیت دی گئی ہے اور اسے سعادت میں سے شمار کیا گیا ہے ،البتہ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مکان ایک خاندانی نیک اہداف کے حصول کے لئے وسیلہ بنے ،اس بات کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کئی افراد ایک ہی مکان میں ساکن ہوں اس وقت کم سے کم ہر ایک کے لئے کمرے موجود ہوں جن میں وہ آرام کر سکیں مطالعہ کر سکیں وغیرہ تاکہ ایک خاندان کے

۱۔ نحل ۱۶ : آیہ ۸۰

افراد مختلف نفسیاتی بیماریوں سے بچ سکیں، اس بارے میں ائمہ معصومین علیہم السلام کی جانب سے خاص دستورات بھی ہیں۔

۵۔ نظافت اور صفائی کی ضرورت:

اسلام نے متعدد مقامات پر نظافت اور صفائی کی تاکید کی ہے، دین کی نگاہ میں گندگی اور نجاست ایک منفور کام اور خدا کی ناراضگی کا باعث ہے۔ نہانا (جو کہ صحت کے اسرار میں سے اک سر بھی ہے) کم از کم دو دن میں ایک بار انجام دینے کی تاکید کی ہے۔ دین مقدس اسلام کے بہت سارے احکام معنوی آثار اور برکات کے ساتھ ساتھ ظاہری فوائد کے بھی حامل ہیں جیسے غسل اور وضوء اور ان کے آداب وغیرہ۔ پانی اسلام میں پاک کرنے والی چیزوں میں سے ایک ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گندہ بدبودار اور غبار آلود انسانوں سے نفرت کرتے تھے۔ جب آپ ص سے غبار آلود اور کثیف انسان سے برتاؤ سے متعلق پوچھا گیا تو آپ ص نے فرمایا: (امام صادق علیہ السلام: أَبصَرَ رسول اللّٰه صلي اللّٰه عليه و آله رَجُلاً شَعْثاً شَعْرُ رَأسِهِ وَسَخَةً ثيابُهُ، سَيِّئَةً حالُهُ فَقال رسول اللّٰه صلي اللّٰه عليه و آله: مِن الدّين الْمُتْعَةُ وَاِظْهارُ النِّعْمَةِ)[1]

"اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اور ان کا اظہار کرنا دینداری ہے۔"

اس نظر سے ذاتی اور سماجی نظافت اور صفائی انسان کی ان ضرورتوں میں سے ہے جن میں جسم کی سلامتی، نشاط روحی، نفسیاتی سکون، واجبات دینی کی ادائیگی، سماج کی خدمت کا جذبہ اور دیگر ہزاروں فوائد چھپے ہوئے ہیں۔

۶۔ جسمانی توانائی کی ضرورت:

اسلامی ثقافت میں دوسری ثقافتوں کے برخلاف جسم انسان کوئی حقیر چیز نہیں ہے۔ اسلام اس بات کا معتقد ہے کہ جسم انسان روح کی ارتقاء اور تکامل کے لئے وسیلہ ہے اور جسم کی توہین شخصیت کی توہین ہے۔ اگر کوئی اس گناہ کا مرتکب ہوا تو وہ سزا کا حقدار ہے۔ اسلام جسمانی صحت و سلامتی کے لئے ایک خاص اہمیت کا قائل ہے۔ ایک طرف سے ایکسرسائز اور تمرین کا انسان کی سلامت کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔ دینی تعلیمات میں جسم کی سلامتی کا خیال رکھنے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خداوند متعال فرماتا ہے: (وَقَالَ

۱۔ کافی، ج ۶، ص ۴۳۹، ح ۵

لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ) [1] "اوران کے پیغمبر نے ان سے کہا: اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، کہنے لگے: اسے ہم پر بادشاہی کرنے کا حق کیسے مل گیا؟ جب کہ ہم خود بادشاہی کے اس سے زیادہ حقدار ہیں اور وہ کوئی دولتمند آدمی تو نہیں ہے، پیغمبر نے فرمایا: اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسے منتخب کیا ہے اور اسے علم اور جسمانی طاقت کی فراوانی سے نوازا ہے اور اللہ اپنی بادشاہی جسے چاہے عنایت کرے اور اللہ بڑی وسعت والا، دانا ہے۔"

(وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَى آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ) [2] "اور جب موسیٰ رشد کو پہنچ کر تنومند ہو گئے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔"

(قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ) [3] "ان دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہا: اے ابا! اسے نوکر رکھ لیجیے کیونکہ جسے آپ نوکر رکھنا چاہیں ان میں سب سے بہتر وہ ہے جو طاقتور، امانتدار ہو۔"

(وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ) [4] "اور یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اس نے تمہیں جانشین بنایا اور تمہاری جسمانی ساخت میں وسعت دی (تنومند کیا)، پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو، شاید تم فلاح پاؤ"

امام سجاد علیہ السلام دعائے ابو حمزہ ثمالی میں خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ: (اللَّهُمَّ أَعْطِنِي السَّعَةَ فِي الرِّزْقِ .....وَالصِّحَّةَ فِي الْجِسْمِ وَالْقُوَّةَ فِي الْبَدَنِ) [5] "اے میرے اللہ! مجھے رزق میں وسعت و برکت، جسم میں صحت و سلامتی اور بدن میں قوت و توانائی عطا کر۔"

۱۔ بقرہ ۲: آیہ ۲۴۷
۲۔ قصص ۲۸: آیہ ۱۴
۳۔ قصص ۲۸: آیہ ۲۶
۴۔ اعراف ۷: آیہ ۶۹
۵۔ دعای ابو حمزہ ی ثمالی-قسمت ۲۰-مفاتیح الجنان

(قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ: لَا سَبَقَ إِلَّا فِي حَافِرٍ، أَوْ نَصْلٍ، أَوْ خُفٍّ)[1] "مسابقہ اور مقابلہ (جس میں شرط لگائی جائے) صرف تین چیزوں کے علاوہ صحیح نہیں ہے۔ گھڑ سواری (اور ایسے حیوانات پر سوار ہونا جن کے پاؤں میں سم یعنی نعل لگائی جاتی ہے)، اونٹ سواری (اور ایسے حیوانات پر سوار ہو کر مقابلہ کرنا جن کے پاؤں میں نعل نہیں ہوتی) اور تیر و تلوار و غیرہ (ایسا ہتھیار جو سخت تیز اور کاٹنے والا ہو) کا مقابلہ۔ "مرّ النبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم برجلین کانا یتصارعان فلم ینکر علیھما "آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا دو آدمیوں سے گزر ہوا یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کشتی لڑ رہے تھے آپ ص نے یہ منظر دیکھ کر انہیں منع نہیں کیا (یعنی آپ نے اپنے اس کام سے ان کی تائید فرمائی)"

اسی طرح حسنین علیہما السلام کا ایک دوسرے سے کشتی لڑنے کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ: (أبو غسان، باسناده، أن رسول الله صلّى الله عليه و آله نظر الى الحسن و الحسين عليهما السلام، و هما صبيان صغيران يصرعان، فجعل يقول للحسن: إيها حسن!. فقالت فاطمة عليها السلام: يا رسول الله، كأنه أحبهما إليك هو أكبرهما تقول له: إيها. قال: كلا، و لكن هذا جبرائيل عليه السلام يقول: إيها حسين)[2]

"ابو غسان اپنے اسناد کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم حسنین علیہما السلام کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دونوں ایک دوسرے سے کشتی لڑ رہے تھے آپ ص نے حسن سے فرمایا حسن! حسین کو گراؤ، اس وقت جناب زہرا سلام اللہ علیہا کہنے لگی یا رسول اللہ! حسن چونکہ بڑا بیٹا ہے اس لئے آپ اسے زیادہ چاہتے ہونگے اور اس کو تشویق کر رہے ہیں۔ پیغمبر ص کہنے لگے نہیں ایسا نہیں ہے لیکن یہ جبریل ہے جو حسین ع کو تشویق کر رہے ہیں۔ (تو میں حسن کو تشویق کرتا ہوں تاکہ برابر ہو جائے۔)"

انسان کی اجتماعی ضرورتیں

۱۔ سہولیات اور فلاح و بہبود کی ضرورت

دین انسان سازی اور انسانی معاشرے کی فلاح و بہبود کی خاطر آیا ہے۔ جب انسان کو سب چیزیں مل جائیں جو اس کی نشو و نما اور زندگی کو چلانے کے لئے ضروری ہیں اور ان کاموں

۱۔ الفصول المهمة فی أصول الأئمة (تكملة الوسائل)، جلد ۲، صفحہ ۳۱۲، حدیث: ۲۴۹۰۵

۲۔ شرح الأخبار-القاضی النعمان المغربی-ج ۳-الصفحة ۷۹

سے بچ جائے جن کا انجام فقر و ناداری ہے تو وہ اہم کاموں کے بارے میں سوچ سکتا ہے ، اپنی اور دوسروں کی خاطر علمی اور تربیتی ترقی کا سوچ سکتا ہے ۔ اسی چیز کا فقدان ہے کہ بہت سے انسان فقیری اور امیری ، ناداری اور ثروتمندی کے اتار چڑھاؤ میں اپنی بہت سی صلاحیتوں کو کھو دیتے ہیں اور بری خصلتیں ان کے دل و ماغ میں بس جاتی ہیں ، بسا اوقات قوت فکر مفلوج ہو جاتی ہے اور سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے ہیں ۔

اسی لئے مال جمع کرنا اور ضرورت کی سہولتوں کا حاصل کرنا انسانی ضرورتوں میں سے ہے دین اسلام کی تعلیمات میں ان چیزوں کی بہت زیادہ سفارش ہوئی ہے ۔ معاشرہ کے ارباب عقد و حل اور صاحب کرسی و منصب افراد پر ضروری قرار دیا گیا ہے کہ معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لئے ان سہولتوں تک رسائی کو آسان بنائیں ۔ کیونکہ جس معاشرے میں فقر و ناداری کی حکمرانی ہو وہ معاشرہ قسم قسم کی بیماریوں اور برائیوں کے لئے جنم گاہ بن جاتا ہے ۔

فلاح و بہبود قرآن کی نگاہ میں:

(وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَاراً)[۱] "وہ اموال اور اولاد کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے لیے باغات بنائے گا اور تمہارے لیے نہریں بنائے گا ۔" (فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيراً لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ)[۲] "پھر جب نماز ختم ہو جائے تو (اپنے کاموں کی طرف) زمین میں بکھر جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۔"

(وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَاماً وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلاً مَعْرُوفاً)[۳] "اور اپنے وہ مال جن پر اللہ نے تمہارا نظام زندگی قائم کر رکھا ہے بیوقوفوں کے حوالے نہ کرو (البتہ) ان میں سے انہیں کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے اچھے پیرائے میں گفتگو کرو ۔" وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبّاً جَمّاً "اور مال کے ساتھ جی بھر کر محبت کرتے ہو ۔" وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ "اور انہیں اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے دے دو ۔"

۱۔ نوح ۷۱ : آیہ ۱۲

۲۔ سورہ جمعہ ۶۲ : آیہ ۱۰

۳۔ نساء ۴ : آیہ ۵

فلاح و بہبود روایت کی روشنی میں:

امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں: (فَخَلَقَ لَهُمُ اللَّيْلَ لِيَسْكُنُوا فِيهِ مِنْ حَرَكَاتِ التَّعَبِ وَ نَهَضَاتِ النَّصَبِ، وَ جَعَلَهُ لِبَاساً لِيَلْبَسُوا مِنْ رَاحَتِهِ وَ مَنَامِهِ، فَيَكُونَ ذَلِكَ لَهُمْ جَمَاماً وَ قُوَّةً، وَلِيَنَالُوا بِهِ لَذَّةً وَ شَهْوَةً وَ خَلَقَ لَهُمُ النَّهَارَ مُبْصِراً لِيَبْتَغُوا فِيهِ مِنْ فَضْلِهِ، وَلِيَتَسَبَّبُوا إِلَى رِزْقِهِ، وَيَسْرَحُوا فِي أَرْضِهِ، طَلَباً لِمَا فِيهِ نَيْلُ الْعَاجِلِ مِنْ دُنْيَاهُمْ، وَ دَرَكُ الْآجِلِ فِي أُخْرَاهُمْ بِكُلِّ ذَلِكَ يُصْلِحُ شَأْنَهُمْ)[1]

«چنانچہ اس نے ان کے لیے رات بنائی تاکہ وہ اس میں تھکا دینے والے کاموں اور خستہ کر دینے والی کلفتوں کے بعد آرام کریں اور اسے پردہ قرار دیا تاکہ سکون کی چادر تان کر آرام سے سوئیں اور یہ ان کے لیے راحت و نشاط اور طبعی قوتوں کے بحال ہونے اور لذت و کیف اندوزی کا ذریعہ ہو اور دن کو ان کے لیے روشن و درخشاں پیدا کیا تاکہ اس میں (کار و کسب میں سرگرم عمل ہو کر) اس کے فضل کی جستجو کریں اور روزی کا وسیلہ ڈھونڈیں اور دنیاوی منافع اور اخروی فوائد کے وسائل تلاش کرنے کے لیے اس کی زمین میں چلیں پھریں۔ ان تمام کارفرمائیوں سے وہ ان کے حالات سنوارتا ہے۔»

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: (نِعْمَ الْعَوْنُ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ)[2] «دنیا آخرت کے لئے ایک بہترین مددگار اور یاور ہے۔»

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم فرماتے ہیں: (مِنْ سَعَادَةِ الْمُسْلِمِ سَعَةُ الْمَسْكَنِ وَ الْجَارُ الصَّالِحُ وَ الْمَرْكَبُ الْهَنِيءُ)[3] «مسلمان کے لئے سعادت ہے گھر کا کشادہ اور وسیع ہونا، نیک اور صالح ہمسایہ کا ہونا اور بہترین مرکب کا ہونا۔»

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: (إن الإنسان إذا ادخر طعام سنته خف ظهره و استراح و كان أبو جعفر و أبو عبد الله عليهما السلام لا يشتريان عقدة حتي يحرزا طعام سنتهما)[4] «انسان جب ایک سال کے لئے کھانے پینے کی چیزیں ذخیرہ کرتا ہے تو اس کا دوش ہلکا ہو جاتا ہے اور اطمئنان کی سانس لیتا ہے۔ اسی لئے امام باقر اور امام صادق (علیہما السلام)

۱۔ صحیفہ سجادیہ-دعای شمارہ ۶

۲۔ الکافی، جلد ۵، صفحہ ۷۳، حدیث: ۱۱۲۲۵۷

۳۔ النوادر (للراوندی)، جلد ۱، صفحہ ۲۴، حدیث: ۴۹۶۹۳۲

۴۔ الکافی، الجزء ۵، الصفحۃ ۸۹، الحدیث: ۱۱۲۳۲۹

جب تک سال کے کھانے کا بندوبست نہیں کرتے تھے تب تک باغ نہیں خریدتے تھے۔»

۲۔مال ودولت کی ضرورت:

اسلامی اقتصادی نقطہ نظر سے بنیادی اصل تو یہ ہے کہ اموال کا مالک خدا کو جانیں، یہ خود ایمان باللہ کے نتائج میں سے ایک ہے، قرآن کریم میں جگہ جگہ اس اصل کی تاکید ہوئی ہے: (وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطاً) [۱] "اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب احاطہ رکھنے والا ہے۔"

اس بعد ان چیزوں کو استعمال کرنے کا امر ہو رہا ہے جو پاک اور حلال ہوں: (يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالاً طَيِّباً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ) [۲] "لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"

اس کے بعد نعمتوں کے شکر ادا کرنے کی ترغیب دلائی جا رہی ہے اور شکر کرنے کی پاداش میں مزید نعمتیں بڑھانے کا بھی وعدہ کیا جا رہا ہے: (فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالاً طَيِّباً وَاشْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ) [۳] "پس جو حلال اور پاکیزہ رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اس کی بندگی کرتے ہو۔"

(وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ) [۴] "اور (اے مسلمانو! یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے خبردار کیا کہ اگر تم شکر کرو تو میں تمہیں ضرور زیادہ دوں گا۔"

اور پھر حکم دے رہا ہے کہ اسراف نہ کریں، خرچ کرنے میں تقوی الٰہی کی رعایت کریں، طاغوتی راستے کو نہ اپنائیں اور صرف زراندوزی اور مال جمع کرنے میں نہ رہیں بلکہ مقدس اہداف میں بذل اور انفاق کرنے سے دریغ نہ کریں: (وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفاً أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهاً وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ) [۵]

۱۔ نساء۴: آیہ ۱۲۶
۲۔ بقرہ۲: آیہ ۱۶۸
۳۔ نحل۱۶: آیہ ۱۱۴
۴۔ ابراھیم ۱۴: آیہ ۷
۵۔ انعام۶: آیہ ۱۴۱

"اور وہ وہی ہے جس نے مختلف باغات پیدا کیے کچھ چھتریوں چڑھے ہوئے اور کچھ بغیر چڑھے نیز کھجور اور کھیتوں کی مختلف ماکولات اور زیتون اور انار جو باہم مشابہ بھی ہیں اور غیر مشابہ بھی پیدا کیے، تیار ہونے پر ان پھلوں کو کھاؤ، البتہ ان کی فصل کاٹنے کے دن اس (اللہ) کا حق (غریبوں کو) ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو، بتحقیق اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

(فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ)[۱] "بہر حال اب تم نے جو مال حاصل کیا ہے اسے حلال اور پاکیزہ طور پر کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔" (كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَى)[۲] "جو پاکیزہ رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور اس میں سرکشی نہ کرو ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا غضب نازل ہوا بتحقیق وہ ہلاک ہوگیا۔" (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ)[۳] "اے ایمان والو! جو مال ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو"

مال خرچ کرنے کا معیار: دین مبین اسلام کی تعلیمات میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی دی ہوئی اموال کو ایک خاص ہدف کی خاطر خرچ کرنا چاہیئے اللہ تعالی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا مقصد مضبوط زندگی اور معاشرے کو خیر کی طرف لے جانے کی کوشش کرنی چاہیئے اور یہ جان لیں کہ مال خود ہدف نہیں ہے۔ خدا نے مالداروں کو اسراف وطغیان اور الٰہی حدود سے گزر جانے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے تاکہ نعمت سب کو مل جائے اور کوئی اس سے محروم نہ رہے، طمع اور اسراف کا قلع قمع ہو سکے۔ اس کی جگہ سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے مواقع سب کو مل جائیں اور انفاق کی ثقافت معاشرے میں عام ہو سکے۔

زمانہ کے ساتھ چلنا: سہولتوں کے مواقع جس طرح بھی ہوں اچھے ہیں اور انسان کو چاہیئے کہ سہولیات کے حصول کے لئے نیک اور پسندیدہ راستوں کو اپنائے اور جدوجہد کرے ان سے فائدہ اٹھائے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ دیکھے کس زمانہ میں جی رہا ہے

۱۔ انفال ۸: آیہ ۶۹
۲۔ طہ ۲۰: آیہ ۸۱
۳۔ بقرہ ۲: آیہ ۲۵۴

آئمہ معصومین کی سیرت میں ہمیں یہ بات بھی ملتی ہے کہ یہ ہستیاں اپنے زمانے کے مطابق زندگی گزارتی تھیں جیسا کہ امام علی علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام کی طرز زندگی میں تفاوت ہے۔

امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ : (إِنَّ أَهْلَ الضَّعْفِ مِنْ مَوَالِيَّ يُحِبُّونَ أَنْ أَجْلِسَ عَلَى اللُّبُودِ وَأَلْبِسَ الْخَشِنَ وَلَيْسَ يَتَحَمَّلُ الزَّمَانُ ذَلِكَ)[1] "میرے تنگ نظر دوستوں کی تمنا ہے کہ میں کھر درے فرش پر بیٹھ جاؤں اور سخت کپڑے پہن لوں لیکن زمانے کا تقاضہ کچھ اور ہے۔" امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :"جو پھل سب کھاتے ہیں وہ اپنے گھر والوں کو بھی دیں۔" امام صادق کی وہ سیرت جسے سفیان ثوری نے نقل کیا۔

مال و دولت کا غلط استعمال : مال و دولت کے غلط استعمال کا نام اسراف ہے اور اسراف یقیناً ایک بہت بڑی لعنت ہے اور یہی انسانی کی مفلسی و بدحالی میں گرنے کی وجہ بنتا ہے۔ انسانی فطرت پر اصولاً جس چیز کی حکمرانی ہونی چاہیئے وہ میانہ روی اور اعتدال ہے اسراف کرنے والا انسان غیر معتدل انسان ہے۔ یہ انسان ان دو حالتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہے یا تو وہ ذہنی بیماری کا شکار ہے یا مادی مشکلات کی وجہ سے راہ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ اور دونوں حالتیں انسان کو تباہی کے کنویں میں گرا دیتی ہیں۔ خدا بھی فرماتا ہے کہ اسراف کرنے والوں کا انجام تباہی اور بربادی ہے :

(وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِينَ)[2] "اور تجاوز کرنے والوں کو ہلاک کر دیا۔"

(وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ حَتَّى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ)[3] "اور بتحقیق اس سے پہلے یوسف واضح دلائل کے ساتھ تمہارے پاس آئے مگر تمہیں اس چیز میں شک ہی رہا جو وہ تمہارے پاس لائے تھے یہاں تک کہ جب ان کا انتقال ہوا تو تم کہنے لگے : ان کے بعد اللہ کوئی پیغمبر مبعوث نہیں کرے گا اس طرح اللہ ان لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے جو تجاوز کرنے والے، شک کرنے والے ہوتے ہیں۔"

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ اللہ یقینا تجاوز کرنے والے جھوٹے کو ہدایت نہیں دیتا۔"

۱۔ مکارم الأخلاق : ۱/ ۲۲۰/ ٦٤٨./ میزان الحکمۃ-محمد الریشهري-ج ٤-الصفحة ٢٧٦٤
۲۔ انبیاء ۲۱ : آیہ ۹
۳۔ غافر ۴۰ : آیہ ۳۴

قرآن کریم کے مطابق اسراف کا لازمہ فساد اور فتنہ ہے : (وَلَاتُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ)[۱] "اور حد سے تجاوز کرنے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو۔ جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔"

اور اس میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اسراف کے بعد ہلاکت بھی یقینی ہے۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں : (مَنْ لَمْ يُحْسِنِ الْاِقْتِصَادَ أَهْلَكَهُ الْإِسْرَافُ)[۲] "جو اچھی طرح سے راہ اعتدال پر نہ چلے اسراف اسے ہلاک کرے گا۔"

پس خرچ کرنے میں راہ اعتدال سے غفلت کا نتیجہ نابودی ہے۔ نفسیاتی طور پر بھی اسراف گر خرچ کے میدان میں ناکام ہو کر ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے اور دنیا کی تمنائیں اس کے سرمایے کو راکھ کر دیتی ہیں، اسراف گر کبھی بھی اقدار انسانی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے اور اسی غفلت کے نتیجے میں وہ اپنے خالق کی نگاہ سے گر جاتا ہے اور اس کی محبت والفت کے سایے سے محروم ہو جاتا ہے : (وَلَاتُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ)[۳]

"اور فضول خرچی نہ کرو، بتحقیق اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

غربت کی حقیقت:

میانہ روی اور معتدل راستے سے ہٹنے کا نتیجہ غربت وافلاس کے کنویں میں گرنا ہے۔ غربت اور فقر کے لغوی معنی احتیاج کے ہیں۔ عام طور پر اس سے تنگ دستی' مفلسی اور ناداری مراد لی جاتی ہے۔ غربت یہ ہے کہ انسان زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم ہو یا ان سہولتوں سے محروم ہو جن سے انسان ترقی اور تکامل کی منزلوں کو طے کر سکتا ہے۔ احادیث میں غربت اور فقر کی جو مذمت کی ہے وہ اسی تعریف سے مربوط ہے، امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں : (اَلْفَقْرُ الْمَوْتُ الْأَكْبَرُ)[۴] فقر اور غربت سب سے بڑی موت ہے۔ "وَالْقَبْرَ خَيْرٌ مِنَ الْفَقْرِ "قبر غربت سے بہتر ہے۔ "پس فقر ایک ایسا مرض ہے جو دھیرے دھیرے پورے مسلم معاشرہ کے بدن میں سرایت کر رہا ہے اور اگر جلد اس کا علاج نہیں

۱۔ شعراء ۲۶ : آیہ ۱۵۱-۱۵۲

۲۔ غرر الحکم ودرر الکلم، جلد ۱، صفحہ ۶۰۲، حدیث : ۴۵۸۳۰۵

۳۔ اعراف ۷ : آیہ ۳۱

۴۔ تحف العقول عن آل الرسول علیہم السلام، جلد ۱، صفحہ ۲۱۴، حدیث : ۳۰۳۷۹۹/ نہج البلاغہ حکمت ۱۶۳ نسخہ صبحی صالح

کیا گیا تو اس کے نتائج بہت ہی زیادہ سنگین ہونگے اس لئے کہ علم اقتصاد کے ماہرین کا خیال ہے کہ جس معاشرہ کی اکثریت غریب ہو وہ معاشرہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ غربت تمام آفتوں اور اخلاقی برائیوں کی ماں ہے اور امیر بیان علیہ السلام کے فرمان کے مطابق سب سے کڑوا، حقیقی بد بختی اور خطاء و عصیان کے زیادہ ہونے کا عامل ہے۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

(الفَقرُ مَعَ الدَّينِ المَوتُ الأَحمَرُ؛ الفَقرُ مَعَ الدَّينِ الشَّقاءُ الأَكبَرُ)[۱] "غربت اور افلاس قرض کے ساتھ سب سے بڑی شقاوت اور بدبختی ہے۔"

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: (كانَ في ما أوصى بِهِ لُقمانُ ابنَهُ أن قالَ: يا بُنَيَّ . . . ذُقتُ المَراراتِ كُلَّها فَلَم أذُق شَيئاً أمَرَّ مِنَ الفَقرِ)[۲] "لقمان کی اپنے بیٹے کو کی گئی نصیحتوں میں سے ہے اے میرا بیٹا! میں نے تمام تلخیوں کا مزہ چکھا لیکن غربت جیسی کوئی تلخی نہیں ہے۔" امام علی علیہ السلام اپنے بیٹے حسن علیہ السلام سے فرماتے ہیں: (الإمامُ عليٌّ عليه السلام ـ لابنِهِ الحَسَنِ عليه السلام ـ: لا تَلُم إنساناً يَطلُبُ قوتَهُ؛ فَمَن عَدِمَ قوتَهُ كَثُرَ خَطاياهُ)[۳] "اس انسان کی ملامت اور سرزنش نہ کرے جو اپنی رزق و روزی کو تلاش کرتا ہے چونکہ جس کے پاس اپنی (اور اپنی گھر والے کے لئے) رزق و روزی نہیں ہے اس کی خطائیں زیادہ ہوجاتی ہیں۔"

غربت سے کفر تک کا سفر:

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ غربت کا کفر سے بھی گہرا رابطہ ہے نادار انسان کا اعتقاد بھی کمزور ہوتا ہے اسی طرح انسان کی عبادتوں اور معنوی امور بھی متاثر ہوجاتے ہیں، اس کا نتیجہ اقدار کی موت ہے، یہ فقر کا وہ پہلو ہے جس کے منفی اثرات انسانی معاشرہ اور سماج کے ہر فرد پر مرتب ہوتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے کہ: (لَولا رَحمَةُ رَبّي عَلى فُقَراءِ اُمَّتي، كادَ الفَقرُ يَكونُ كُفراً)[۴] "اگر میری امت پر خدا کی رحمت نہ ہو تو قریب ہے کہ فقر کفر میں تبدیل ہوجائے۔"

۳۔ معیار سالانہ بجٹ:

قرآن و حدیث کی روشنی میں ضرورتوں اور سہولتوں کا معیار سالانہ حساب ہے، دینی تعلیمات میں آیا ہے کہ اگر ایک انسان کے پاس ایک سال کا خرچہ ہو تو وہ سکون اور اطمینان

۱۔ غرر الحکم: ۱۳۰۸ و ۱۳۰۹

۲۔ الآمالی للصدوق: ۷۶۶/۱۰۳۱ عن حماد بن عیسی.

۳۔ جامع الأخبار: ۳۰۰/۸۱۸

۴۔ جامع الأخبار: ۳۰۰/۸۱۷.

کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور اسی سکون کے سایے میں اس کی مخفی قوتیں اور صلاحیتیں آشکار ہو سکتی ہیں وہ انسان معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے سوچ سکتا ہے۔ اسلام اس معیار کو قائم کرکے ایک سال تک کے لئے سہی فقر و ناداری کو ختم کرنے کے لیے انسانوں کو دعوت دیتا ہے؛ یعنی فقر و ناداری سے مقابلہ کرنے کے لئے کم از کم ایک سال کے لئے نان و نفقہ کا بندوبست ہو جائے۔ مسلمان حکمرانوں پر ضروری ہے کہ اس عظیم ہدف کے حصول کے لئے پروگرام بنائیں۔

وہ شخص جس کے لئے ایک سال کے نان و نفقہ کا بندوبست ہو جائے یا کم از کم پورا کرنے کی راہیں فراہم ہو جائیں مثلاً کوئی نوکری یا روزگار مل جائے مالی لحاظ سے اسے کوئی پریشانی لاحق نہ ہو جو تو وہ سماج میں عزت والے انسان کے طور پر رہتا ہے گھر میں بھی وہ ہر دلعزیز شخصیت ہوتا ہے، پیش آنے والے حادثات سے بخوبی نپٹ سکتا ہے اپنے بال بچوں اور شریک حیات کے لئے خوشی اور آرامش کا باعث بنتا ہے۔ یہیں سے اخلاقی برائیاں سماج سے مٹ سکتے ہیں، آبرو کی رکھوالی کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔ شرافت اور عزت کو بنیادی ضرورتوں اور فقر و ناداری پر قربان نہیں کیا جائے گا، طبقاتی فاصلے، ایک دوسرے پر شک و شبہ، ایک دوسرے کی توہین اور حقارت معاشرے میں عام نہیں ہوگی۔ اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا سکتا ہے کہ جناب شیخ حر عاملی نے وسائل الشیعہ کا پورا ایک باب اسی سے مخصوص کیا ہے اس باب کا عنوان یہ ہے: (. باب جواز اعطاء المستحق من الزکاۃ ما یغنیہ، وانہ لا حد لہ فی الکثرۃ الا من یخاف منہ الاسراف فیعطی قدر کفایتہ لسنتہ)[1] مستحق کو کفایت کی مقدار تک زکات دینا جائز ہے زیادہ دینے کی کوئی حد نہیں جب تک اسراف کا خطرہ نہ ہو ایسی صورت میں اسے ایک سال کی کفایت کی حد تک دی جائے۔

فلسفہ مال:

اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ انسان محور اور مرکز ہے تمام اشیاء انسان کی خدمت کے لئے ہیں جتنے بھی وسائل اور ذرائع اس کائنات میں موجود ہیں سب حضرت

۱۔ الفروع ج ۱ ص ۱۵۵/ وسائل الشیعۃ- ط الإسلامیۃ نویسندہ: الشیخ حر العاملی جلد: ۶ صفحہ: ۱۷۸

انسان کی خدمت کے لئے ہیں اور ساری ہستی انسان کے گرد گومتی ہیں۔ جب کہ سرمایہ داری سوچ کے مطابق مال محور ہے اور انسان توسیع سرمایہ کے لئے ایک آلہ کار ہے۔
اسلامی تعلیمات اس کے برخلاف ہے کہ نظام سرمایہ داری، اپنے لئے زیادہ کی چاہت، خرچ کرنے میں اسراف کرنا اور مال کے جمع وخرچ کرنے میں پروگرام کے بغیر قدم اٹھانا انسان کے لئے ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے، یہ کام معاشرے کو برائی اور فساد کے کنویں میں پھینکنے کے مترادف ہے اس سے سماج میں برائیاں جنم لیتی ہیں، اور بہت سے نفسیاتی اور معاشرتی بیماریوں کو وجود میں لانے کے لئے پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: (وَاعْلَمُوا أَنَّ كَثْرَةَ الْمَالِ مَفْسَدَةٌ لِلدِّينِ مَقْسَاةٌ لِلْقُلُوبِ)[1] "جان لیں کہ! مال کا زیادہ ہونا دین کی تباہی اور سنگدلی کا باعث ہے۔"
اسلامی معیشت کا فلسفہ مال کے "قوام" ہونے پر مبنی ہے۔ اسی لئے پروردگار اسے بے وقوفوں کے ہاتھوں دینے سے منع کر رہا ہے اور انہیں صرف کھلانے پلانے اور پہنانے کا حکم دے رہا ہے: (وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَاماً وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلاً مَعْرُوفاً)[2] "اور اپنے وہ مال جن پر اللہ نے تمہارا نظام زندگی قائم کر رکھا ہے بیوقوفوں کے حوالے نہ کرو (البتہ) ان میں سے انہیں کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے اچھے پیرائے میں گفتگو کرو۔"
پس مال قوام زندگی ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب مال بعض خاص لوگوں تک محدود نہ رہے اور سب کے ہاتھوں میں پہنچ جائے کہ اس کی برکتوں سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی زندگی کو مضبوط کریں۔ اگر ایسا نہ ہو جائے تو مال کی افادیت ہی نابود ہو جاتی ہے اسی لئے اسے بے وقوفوں کے ہاتھوں دینے سے منع کیا کیونکہ بے وقوف کے لئے یہ قوام نہیں ہے بلکہ یہ لوگ غلط جگہ خرچ کر کے اس عظیم سرمایہ کو جو کہ زندگی کا قوام اور سہارا ہے، نابود کریں گے۔
اسی لئے امام رضا علیہ السلام نے ربا اور سود کو مال کے ضیاع اور سماجی سہولتوں کی نابودی قرار دیا۔ آپ ع فرماتے ہیں: (وَعِلَّةُ تَحْرِيمِ الرِّبَا لِمَا نَهَى اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ عَنْهُ

۱۔ بحار الأنوار الجامعة لدرر أخبار الأئمة الأطهار علیہم السلام، جلد ۱، صفحہ ۱۷۵، حدیث: ۲۲۱۱۷۶
۲۔ نساء ۴: آیہ ۵

وَ لِمَا فِيهِ مِنْ فَسَادِ الْأَمْوَالِ لِأَنَّ الْإِنْسَانَ إِذَا اشْتَرَى الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ كَانَ ثَمَنُ الدِّرْهَمِ دِرْهَماً وَ ثَمَنُ الْآخَرِ بَاطِلًا فَبَيْعُ الرِّبَا وَ شِرَاؤُهُ وَ كُسٌّ عَلَى كُلِّ حَالٍ عَلَى الْمُشْتَرِي وَ عَلَى الْبَائِعِ فَحَرَّمَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ عَلَى الْعِبَادِ الرِّبَا لِعِلَّةِ فَسَادِ الْأَمْوَالِ كَمَا حَظَرَ عَلَى السَّفِيهِ أَنْ يُدْفَعَ إِلَيْهِ مَالُهُ لِمَا يُتَخَوَّفُ عَلَيْهِ مِنْ إِفْسَادِهِ حَتَّى يُؤْنَسَ مِنْهُ رُشْدُهُ فَلِهَذِهِ الْعِلَّةِ حَرَّمَ اللَّهُ عَزَّ وَ جَلَّ الرِّبَا وَ بَيْعُ الرِّبَا بَيْعُ الدِّرْهَمِ بِالدِّرْهَمَيْنِ وَ عِلَّةُ تَحْرِيمِ الرِّبَا بَعْدَ الْبَيِّنَةِ لِمَا فِيهِ مِنَ الِاسْتِخْفَافِ بِالْحَرَامِ الْمُحَرَّمِ وَ هِيَ كَبِيرَةٌ بَعْدَ الْبَيَانِ وَ تَحْرِيمِ اللَّهِ عَزَّ وَ جَلَّ لَهَا لَمْ يَكُنْ ذَلِكَ مِنْهُ إِلَّا اسْتِخْفَافاً بِالْمُحَرَّمِ الْحَرَامِ وَ الِاسْتِخْفَافُ بِذَلِكَ دُخُولٌ فِي الْكُفْرِ وَ عِلَّةُ تَحْرِيمِ الرِّبَا بِالنَّسِيئَةِ لِعِلَّةِ ذَهَابِ الْمَعْرُوفِ وَ تَلَفِ الْأَمْوَالِ وَ رَغْبَةِ النَّاسِ فِي الرِّبْحِ وَ تَرْكِهِمْ لِلْقَرْضِ وَ الْقَرْضُ صَنَائِعُ الْمَعْرُوفِ وَ لِمَا فِي ذَلِكَ مِنَ الْفَسَادِ وَ الظُّلْمِ وَ فَنَاءِ الْأَمْوَالِ)[1]

"اور سود کے حرام ہونے کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اور اس لئے کہ اس میں مال کا نقصان ہے کیونکہ انسان جب ایک درہم کو دو دہموں میں خریدے گا تو ایک درہم تو ایک درہم کی قیمت ہوئی اور دوسرا درہم باطل اور بلا قیمت چلا جاتا ہے تو سود کی خرید و فروخت ہر حال میں نقصان دہ ہے خرید کرنے والے کے لئے بھی اور فروخت کرنے والے کے لئے بھی؛ اس لئے اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر سود حرام کردیا کہ بس مال کا نقصان ہوتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے کسی ناسمجھ کو اس کا مال حوالہ کرنا منع ہے کہ کہیں اس کو ضائع نہ کردے جب تک وہ سمجھدار نہ ہوجائے۔ تو اسی لئے اللہ تعالی نے سود اور سود کی خرد و فروخت اور ایک درہم کو دو دہم پر فروخت کرنا حرام کردیا ہے اور ان دلیلوں کے بعد سود کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے اللہ تعالی کے حکم تحریم کا استخفاف کفر میں داخل کردیتا ہے اور واضح بیان کے بعد سود لینا یا دینا استخفاف حکم باری تعالی کے سوا کچھ نہیں ہے اور حکم الہی کا استخفاف کفر میں داخل ہونا ہے اور ادھار اور قرض پر سود کی حرمت شاید اس لئے ہے کہ اس سے حسن سلوک ختم ہوجائے گا مال کا اتلاف ہوگا لوگوں کی نفع کی طرف رغبت بڑھے گی اور قرض لینا متروک ہوجائے گا اور قرض دینا خود ایک نیکی اور حسن سلوک ہے اور علاوہ بر این اس سود میں فساد، ظلم اور مال کا اتلاف بھی ہے۔"

۱۔ تفسیر اہل بیت علیہم السلام ج ۲، ص ۱۳۸۶ القمی، ج ۱، ص ۹۳/ نور الثقلین

اسی لئے ضرورت اس بات کی ہے کسی معاشرے میں مال اور سہولت کی اشیاء بعض خاص افراد تک محدود نہ رہ جائیں اور تمام لوگوں کی دسترسی میں پہنچ جائیں۔

۴۔ حمایت، ہمدردی اور حوصلہ کی ضرورت:

انسان کی مادی ضرورتوں سے نمٹنے والے معتدل راستے کے اصولوں میں سے ایک، ایک دوسرے کو حوصلہ دینا ہے؛ اس لئے کہ اگر انسان کے لئے اس کی بنیادی ضرورتیں میسر ہوں اور دنیا طلب لوگوں کے منھے نہ چڑھ جائے، تو اس کے دل میں کسی کے لئے کینہ و کدورت نہیں ہوگا بلکہ ایک دوسرے کی نسبت محبت اور الفت کا احساس کرے گا اور اس طرح اختلاف، کینہ، حسد اور کدورتیں قلع قمع ہوجائیں گے۔ تب انسان کمال کی طرف جانے کا سوچ سکتا ہے اور اسی لئے کہ معتدل راستے کی معرفت اور اس پر چلنا ضروری ہے اسی لئے کسی کا کہنا ہے: «انسان کسی دوسرے کے لے اور کچھ نہیں کرسکتا، سوائے اس کا حوصلہ بڑھانے کے۔ میں نے جتنے لوگوں کو ٹوٹتے دیکھا، فقط اس لئے کہ رشتوں اور دوستوں کے ہجوم میں کسی نے ان کو یہ نہیں کہا کہ حوصلہ کریار، اللہ کرم کرے گا۔ یقین کریں بہت طاقت ہے اس ایک جملے میں۔»

جب تک ہم کسی کے ہمدرد نہیں بنتے تب تک درد ہم سے اور اور ہم درد سے جدا نہیں ہوسکتے۔ پس اگر راہ اعتدال سے منحرف ہوجائے تو معاشرے سے امن اور سلامتی چلی جائے گی، الفت بھائی چارگی اور محبت نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گی، انسان ایک دوسرے کے ساتھ حیوانوں جیسی رفتار کرے گا۔ جیسا کہ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

(..... فَإِنَّمَا أَهْلُهَا كِلَابٌ عَاوِيَةٌ وَ سِبَاعٌ ضَارِيَةٌ يَهِرُّ بَعْضُهَا بَعْضًا وَ يَأْكُلُ عَزِيزُهَا ذَلِيلَهَا وَ يَقْهَرُ كَبِيرُهَا صَغِيرَهَا نَعَمٌ مُعَقَّلَةٌ وَ أُخْرَى مُهْمَلَةٌ قَدْ أَضَلَّتْ عُقُولَهَا وَ رَكِبَتْ مَجْهُولَهَا سُرُوحُ عَاهَةٍ بِوَادٍ وَعْثٍ لَيْسَ لَهَا رَاعٍ يُقِيمُهَا وَ لَا مُسِيمٌ يُسِيمُهَا سَلَكَتْ بِهِمُ الدُّنْيَا طَرِيقَ الْعَمَوَ أَخَذَتْ بِأَبْصَارِهِمْ عَنْ مَنَارِ الْهُدَى فَتَاهُوا فِي حَيْرَتِهَا وَ غَرِقُوا فِي نِعْمَتِهَا وَ اتَّخَذُوهَا رَبّاً فَلَعِبَتْ بِهِمْ وَ لَعِبُوا بِهَا وَ نَسُوا مَا وَرَاءَهَا رُوَيْداً يُسْفِرُ الظَّلَامُ كَأَنْ قَدْ وَرَدَتِ الْأَظْعَانُ يُوشِكُ مَنْ أَسْرَعَ أَنْ يَلْحَقَ.....)[1]

۱۔ اوصاف اہل دنیا، نامہ ۳۱ نہج البلاغہ، (نسخہ صبحی صالح)

"دنیا دار افراد صرف بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں جہاں ایک دوسرے پر بھونکتا ہے اور طاقت والا کمزور کو کھا جاتا ہے اور بڑا چھوٹے کو کچل ڈالتا ہے ۔ یہ سب جانور ہیں جن میں بعض بندھے ہوئے ہیں اور بعض آوارہ جنھوں نے اپنی عقلیں گم کردی ہیں اور نا معلوم راستہ پر چل پڑے ہیں ۔ گویا دشوار گذار وادیوں میں مصیبتوں میں چرنے والے ہیں جہاں نہ کوئی چرواہا ہے جو سیدھے راستہ پر لگا سکے اور نہ کوئی چرانے والا ہے جو انہیں چرا سکے ۔ دنیا نے انہیں گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا ہے اور ان کی بصارت کو منارہ ہدایت کے مقابلہ میں سلب کرلیا ہے اور وہ حیرت کے عالم میں سر گرداں ہیں اور نعمتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں ۔ دنیا کو اپنا معبود بنالیا ہے اور وہ ان سے کھیل رہی ہے اور وہ اس سے کھیل رہے ہیں اور سب نے آخرت کو یکسر بھلا دیا ہے ۔ ٹھہرو! اندھیرے کو چھٹنے دو ۔ ایسا محسوس ہوگا جیسے قافلے آخرت کی منزل میں اتر چکے ہیں اور قریب ہے کہ تیز رفتار افراد اگلے لوگوں سے ملحق ہوجائیں ۔"

نتیجہ:

انسان کی فردی زندگی کی کچھ ضرورتیں ہیں جیسے خوبصورت لباس، ظاہری آراستگی، مناسب گھر، جسم کی سلامتی کے لئے صفائی کا خاص خیال رکھنا، خوشبو لگانا، مسواک کرنا، سرمہ لگانا وغیرہ۔

انسان کے ان تمام ظاہری آداب کا باطن کے ساتھ گہرا رابطہ ہے ۔ اسی لئے شرع مقدس نے ان آداب کو نماز روزہ وغیرہ کے لئے مستحب قرار دیا مثلاً نماز سے پہلے مسواک کرنا اور خوشبو لگانا وغیرہ ۔

خداوند متعال اس کائنات کو انسان کے لیے بنایا ہے اور اِس میں اُس کی مادی ضرورتیں رکھ دی ہے اور ضروریات زندگی کا پورا کرنا اُس پر واجب ہے ۔ اگر انسان مادی ضرورتوں سے فائدہ نہیں اٹھائے گا تو اس دنیا میں غریب و مفلس رہے گا ۔ جبکہ غربت ایک مذموم صفت ہے اس سے بچنے کے لئے اسلام نے میانہ روی، راہ اعتدال اور کسب و کار کا حکم دیا ہے ۔

منابع

قرآن مجید

نہج البلاغہ

۱۔ ابن بابویہ، ابی جعفر محمد بن علی، من لایحضرہ الفقیہ، مترجم: سید حسن امداد صاحب، کراچی، الکساء پبلیشرز، طبع: قریشی آرٹ پریس ناظم آباد کراچی۔

۲۔ ابن حیون، نعمان بن محمد، شرح الأخبار فی فضائل الأئمۃ الأطہار علیہم السلام، قم، موسسۃ النشر الاسلامی، طبع: ثانیۃ

۳۔ ابن شعبہ حرانی، حسن بن علی، تحف العقول عن آل الرسول صلی اللہ علیہ و آلہ، بیروت لبنان، ناشر موسسہ الاعلمی للمطبوعات، طبع: ۱۴۲۳ھ-۲۰۰۲م

۴۔ ابن شہر آشوب، مناقب آل ابی طالب علیہم السلام، المکتبہ الحیدریہ

۵۔ اربلی، علی بن عیسی، کشف الغمۃ فی معرفۃ الأئمۃ، بیروت، مرکز الطباعۃ والنشر للمجمع العالمی لاھل البیت، طبع: ۱۴۳۳ھ-۲۰۱۲م

۶۔ برقی، ابوجعفر، احمد بن محمد بن خالد، المحاسن (للبرقی)، قم (ایران)، دارالکتب الاسلامیہ

۷۔ بروجردی، آقاحسین طباطبایی، جامع أحادیث الشیعۃ، قم، المہر، ۱۴۲۲ھ

۸۔ حرعاملی، شیخ محمد بن حسن، وسائل الشیعہ، ترجمہ: محمد حسین ڈھکو، سرگودھا، مکتبۃ السبطین، طبع اول: مارچ ۲۰۰۱ء، طبع دوم: جولائی ۲۰۱۲ء

۹۔ حلّی، رضی الدین، علی بن یوسف بن مطہر، العدد القویۃ لدفع المخاوف الیومیۃ، قم (ایران)، مکتبۃ آیۃ المرعشی العامۃ، طبع: مطبعۃ سید الشہداء، تاریخ طبع: ۱۴۰۸ھ ق

۱۰۔ حمیری، عبداللہ بن جعفر، قرب الإسناد، قم، موسسۃ آل البیت، طبع: ۱۴۲۳ھ

۱۱۔ راوندی، قطب الدین، دعوات الراوندي، قم، مدرسۃ الامام المہدی (ع)، طبع: ۱۴۰۸ھ

۱۲۔ طبرسی، رضی الدین، مکارم الأخلاق؛ ص ۷۹، قم، ایران، صبح پیروزی، ۱۳۹۳

۱۳۔ طوسی، ابوجعفر، محمد بن حن، الأمالی، قم (ایران)، قسم الدراسات الاسلامیۃ۔ موسسۃ البعثۃ، طبع اول: ۱۴۱۴ھ

۱۴۔ طوسی، محمد بن الحسن، (۱۴۱۱ق) مصباح المتہجد وسلاح المتعبد، بیروت: مؤسسہ فقہ الشیعہ، چاپ اول

۱۵۔ فیض کاشانی، محمد محسن بن شاہ مرتضی، الوافی، اصفہان (ایران)، مکتبۃ الامام امیر المومنین علی العامۃ، چاپ: اول ۱۴۰۶ق

۱۶۔ کلینی رازی، محمد بن یعقوب، الکافی، بیروت لبنان، موسسۃ الاعلمي للمطبوعات

۱۷۔ نوری، محدث، میرزا حسین، مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل، قم، موسسۃ آل البیت لاحیاء التراب، تاریخ طبع: ۱۴۰۸ھ

قرآن کریم میں انبیاء الٰہی کے علوم

غلام مہدی آخوندزادہ

خلاصہ:
اس مقالہ میں قرآن کریم میں مذکور انبیاء کرام کو عطا کردہ مختلف اقسام کے علوم کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ قرآن انبیاء کو صرف پیغام رساں نہیں بلکہ علم و حکمت، فہم و فراست، اور الہامی شعور کے حامل انسانوں کے طور پر پیش کرتا ہے، جو انسانی تمدن، اخلاقیات، اور سائنسی و فکری ترقی میں بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ تحقیق کا مقصد انبیاء کو دیے گئے علوم کی نوعیت، دائرہ کار اور اثرات کو واضح کرنا ہے، اور یہ دکھانا ہے کہ یہ علوم محض دینی ہدایت تک محدود نہیں، بلکہ انسانی عقل، سائنسی شعور، سماجی نظام اور اخلاقی تربیت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تفسیری، موضوعاتی اور تجزیاتی منہج اختیار کیا گیا ہے، اور قرآنی آیات، مستند تفاسیر اور احادیث سے مدد لی گئی ہے۔ قرآن میں حضرت آدمؑ کو "اسماء کلہا" سکھائے جانے کا واقعہ انسان کی علمی برتری کی علامت ہے، جبکہ حضرت نوحؑ کو کشتی سازی، حضرت ابراہیمؑ کو کائناتی مشاہدے، حضرت یوسفؑ کو خوابوں کی تعبیر، حضرت سلیمانؑ کو منطق الطیر، اور حضرت عیسیٰؑ کو طب و معجزاتی علوم عطا کیے گئے۔ ان تمام علوم کا منبع وحی الٰہی ہے، اور یہ انسان کی فطری و تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کو جامع ترین علم عطا ہوا، اور آپ کو قرآن جیسی کتاب دی گئی جو ہر شعبۂ حیات کے لیے مکمل ہدایت ہے۔ آپ کی سیرت تمام انسانی علوم کا منبع ہے، خواہ وہ اخلاقیات ہوں یا قیادت، قانون ہو یا تعلیم۔

کلیدی الفاظ: قرآن مجید، انبیاء، علمِ وحی، حکمت، بصیرت

مقدمہ

قرآن مجید انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہونے والی ایک ایسی الہامی کتاب ہے، جس میں انبیاء علیہم السلام کی سیرت، تعلیمات اور کردار کو ایک کامل نمونہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انبیاء نہ صرف اللہ تعالیٰ کے پیغام کے حامل تھے بلکہ وہ علم، حکمت، بصیرت اور اخلاق کا مجسم پیکر تھے۔ ان کا علم کسی قسم کی ذاتی تشہیر، اقتدار، مال و دولت یا دنیاوی مفادات کے لیے نہیں تھا بلکہ اس کا اصل مقصد انسانوں کو اللہ کی رضا کی طرف متوجہ کرنا، توحید کا شعور بیدار کرنا، اور فکری و اخلاقی گمراہی سے نکال کر صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ انبیاء کا علم نہ صرف روحانی اور اخلاقی تربیت پر مبنی تھا بلکہ اس علم میں وہ تمام پہلو شامل تھے جو ایک صالح انسانی معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ انہوں نے لوگوں کے دلوں میں سچائی کی محبت اور جھوٹ سے نفرت پیدا کی، ظلم و ستم کی مذمت کی، اور عدل و انصاف، رحم، عفو، ایثار اور مساوات جیسے اصولوں کو معاشرتی نظام کا بنیادی ستون قرار دیا۔ ان کا ہر عمل، قول اور فیصلہ وحی الٰہی کی رہنمائی میں ہوتا، جس کا مقصد دنیا میں فلاح اور آخرت میں نجات کا حصول تھا۔ موجودہ دور میں، جہاں علم کو اکثر مادّی فوائد کے حصول اور طاقت کے مظاہر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، وہاں انبیاء کا علم ایک ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جو علم کو اللہ کی رضا، بندگانِ خدا کی بھلائی اور حق کی سربلندی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہی علم انسان کو حقیقی کامیابی کی طرف لے جاتا ہے ایسی کامیابی جو دنیا و آخرت دونوں کو محیط ہو۔ یہ مقالہ اسی حقیقت کی تلاش ہے کہ قرآن مجید میں انبیاء کو عطا کردہ علوم کی نوعیت، ان کا مقصد، اور ان کے اثرات کیا تھے، اور آج کے دور میں ان علوم کی معنویت اور افادیت کیا ہے۔ اس تحقیق میں انبیاء کے علمی ورثے کا مطالعہ کیا جائے گا تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ان کا علم محض تاریخی بیانیہ نہیں بلکہ ایک زندہ اور ہمہ گیر پیغام ہے جو ہر زمانے کے انسان کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

علم کا مقصد: انبیاء کا علم کسی قسم کی ذاتی تشہیر یا دنیاوی مقاصد کے لیے نہیں تھا، بلکہ ان کا مقصد انسانوں کو اللہ کی رضا کی طرف رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ اس علم کے ذریعے انبیاء نے لوگوں کے دلوں میں سچائی کی محبت اور جھوٹ سے نفرت پیدا کی، ظلم و ستم کی مذمت کی، اور عدل و انصاف کی اہمیت کو واضح کیا۔ ان کا علم ہمیشہ ایسے اصولوں پر مبنی تھا جو لوگوں کو دنیا و آخرت میں کامیاب بنانے کے لیے تھا۔

انبیاء کرام کے مخصوص علوم: انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص علوم سے نوازا جو نہ صرف ان کی نبوت کا حصہ تھے بلکہ انسانیت کی فلاح اور رہنمائی کے لیے بھی بنیاد فراہم کرتے تھے۔

۱۔ حضرت آدم علیہ السلام:

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے تمام اشیاء کے نام سکھا کر انسانی علم کی بنیاد رکھی، جو فطرت شناسی، زبان اور شعورِ اشیاء کا پہلا زینہ تھا۔ یہ علم اس بات کی دلیل ہے کہ انسان علم کے ذریعے خلافتِ ارضی کا اہل قرار پایا۔ یہ علم نہ صرف فطری اشیاء کی پہچان کا مظہر تھا بلکہ انسان کی علمی برتری اور استعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فوقیت اسی علمی استعداد کی بنا پر دی گئی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: (وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا...)[1] اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے... یہ آیت علمِ انسانی کے اولین مقام کو ظاہر کرتی ہے، جہاں علم کی اساس براہِ راست اللہ تعالیٰ نے رکھی۔

۲۔ حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی سازی، دعوتِ توحید، اور انذار کا علم دیا گیا، جس کے ذریعے انہوں نے اپنی قوم کو فکری و اخلاقی گمراہی سے بچانے کی کوشش کی۔ حضرت نوح علیہ السلام کو توحید کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا۔ ان کا علم لوگوں کو شرک، ظلم اور فریب سے نجات دلانے کے لیے تھا۔ انہوں نے طویل عرصے تک اپنی قوم کو اخلاص، سچائی، تقویٰ، اور اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی۔ ارشاد خداوندی ہوتا ہے: (إِنِّي لَكُمْ

۱۔ بقرہ ۲: آیہ ۳۱

رَسُولٌ أَمِينٌ۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ)[۱] میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ نوحؑ کو کشتی سازی کا عملی علم بھی عطا کیا گیا: (وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا)[۲] اور ہماری نگرانی و وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام:

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مشاہدۂ کائنات، توحید کے عقلی دلائل، اور فکری استدلال کا علم دیا۔ انہوں نے اپنی قوم سے سوال و جواب کے انداز میں گفتگو کی، جو ایک فکری و فلسفیانہ طرزِ دعوت کی علامت ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا علم عقل و فطرت کے اصولوں پر مبنی تھا۔ انہوں نے توحید کو عقلی و مشاہداتی دلائل سے ثابت کیا۔ اللہ نے انہیں کائناتی نظام کے مشاہدے کا علم عطا کیا تاکہ ان کا یقین کامل ہو جائے۔ خداوند متعال قرآن میں ارشاد فرماتا ہے: (وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ ٱلْمُوقِنِينَ)[۳] اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی تاکہ وہ یقین والوں میں سے ہو جائے۔

۴۔ حضرت یوسف علیہ السلام:

حضرت یوسف علیہ السلام کو خوابوں کی تعبیر کا علم عطا کیا گیا، جو انسانی نفسیات، بصیرت اور اللہ سے براہِ راست الہام کا مظہر تھا۔ ان کا علم نہ صرف تعبیرِ رویا میں کمال رکھتا تھا بلکہ وہ انتظامی اور معاشی بصیرت کا بھی اعلیٰ نمونہ تھے، جیسا کہ مصر کے خزانے سنبھالنے میں ان کی مہارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

۵۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شریعت، قیادت، اور قانون سازی کا علم دیا، جس کے ذریعے انہوں نے بنی اسرائیل کو نظم و انصاف کے ساتھ ایک منظم قوم بنایا اور انہوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دلائی اور اللہ کی نازل کردہ شریعت کے

۱۔ سورہ الشعراء ۲۶: ۱۰۷-۱۰۸

۲۔ سورہ ہود ۱۱: ۳۷

۳۔ سورہ الأنعام ۶: ۷۵

مطابق ان کی رہنمائی کی۔ سورہ اعراف میں اللہ تعالی فرماتا ہے : (وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ) [۱] اور ہم نے ان کے لیے تختیوں میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھی۔

۶۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طب، حکمت، اور معجزات کا علم عطا کیا گیا، جس کے ذریعے وہ لوگوں کے جسمانی اور روحانی امراض کا علاج کرتے تھے۔ ان کے ذریعے اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا ملتی تھی، اور وہ مردوں کو اللہ کے اذن سے زندہ کرتے تھے۔ خداوند منان قرآن مجید مین ارشاد فرماتا ہے : (وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ) [۲] اور میں مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتا ہوں، اور مردے کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔

۷۔ حضرت محمد ﷺ:

آخر کار، حضرت محمد ﷺ کو کامل اور جامع علم عطا کیا گیا، جنہیں "معلمِ انسانیت" بنا کر بھیجا گیا۔ آپ پر نازل ہونے والا قرآن مجید زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فراہم کرتا ہے، اور آپ ﷺ کی سیرت تمام انبیاء کے علوم کا نچوڑ اور عملی نمونہ ہے، لہذا معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کا علم کسی دنیاوی مفاد، ذاتی تشہیر یا شہرت کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ علم الٰہی ہدایت کا ذریعہ تھا جس کا مقصد انسان کو اللہ کی رضا، توحید، عدل، صداقت اور اخلاقی اقدار کی طرف رہنمائی فراہم کرنا تھا۔ انبیاء نے اس علم کے ذریعے قوموں کو روحانی اور فکری گمراہی سے نکالا، اور انہیں وہ اصول و ضوابط سکھائے جو انسان کو دنیا و آخرت کی فلاح کی طرف لے جاتے ہیں۔ (يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ) [۳] وہ انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور آپ پر قرآن مجید نازل کیا، جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتا ہے۔

(وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ) [۴] اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ہر چیز کی وضاحت کرتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو "معلمِ اعظم" بنایا گیا : (هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي

۱۔ سورہ الأعراف ۷ : آیت ۱۴۵

۲۔ سورہ آل عمران ۳ : آیت ۴۹

۳۔ سورہ جمعہ ۶۲ : آیت ۲

۴۔ سورہ النحل ۱۶ : آیت ۸۹

الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ)[1] وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

انبیاء (ع) کے نمایاں خصوصیات

1۔ اللہ کی طرف سے براہ راست علم:

انبیاء کرام کا سب سے نمایاں وصف یہ ہوتا ہے کہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست عطا کیا جاتا ہے۔ یہ علم کسی رسمی تعلیم، مطالعے، تجربے یا مشاہدے کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ خالصتاً الٰہی وحی کا مظہر ہوتا ہے۔ انسانی عقل اور فہم کی حدود جہاں ختم ہوتی ہیں، وہاں سے انبیاء کا علم شروع ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء وہ علم رکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود انہیں عطا فرمایا، جو عام انسانوں کی رسائی سے ماورا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا: (وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا)[2] اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی اور تمہیں وہ کچھ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے۔ اور تم پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔"

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جو علم عطا ہوا، وہ ان کی ذاتی محنت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اللہ کا انعام و فضل تھا۔ انبیاء کی تعلیمات میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کیونکہ ان کا منبع وہی ذات ہے جو ہر چیز کا خالق و مالک ہے۔ انبیاء کا علم زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور اسی لیے وہ ایسی باتیں جانتے ہیں جنہیں عام انسان محض سائنسی یا تجرباتی ذرائع سے نہیں جان سکتے۔

یہ علم صرف الفاظ یا معلومات کی صورت میں نہیں ہوتا بلکہ اس میں حکمت، بصیرت، اور روحانی گہرائی بھی شامل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء کے دلوں کو اپنی وحی کے نور سے منور فرماتا ہے، جس سے ان کے علم میں یقین، سچائی، اور اثر پذیری پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے انبیاء کی باتیں دلوں پر اثر کرتی ہیں اور انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیتی ہیں۔

۱۔ سورہ جمعہ ۶۲: آیت ۲

۲۔ سورہ النساء ۴: آیت ۱۱۳

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انبیاء کے علم میں کوئی غلطی یا شبہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ علم براہ راست ربّ العالمین سے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کو "معصوم" قرار دیا گیا ہے؛ ان کی تعلیمات میں کوئی خامی یا نقص نہیں ہوتا۔ ان کا ہر قول و فعل اللہ کی رہنمائی کے تابع ہوتا ہے۔ لہٰذا، انبیاء کا براہ راست علم اس بات کی علامت ہے کہ ان کی تعلیمات اور پیغام کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان کی باتوں پر ایمان لانا، گویا اللہ پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔

۲۔ روحانی اور اخلاقی علم:

انبیاء کا علم صرف دنیاوی یا مادی نہیں تھا بلکہ یہ ایک بلند روحانی اور اخلاقی نوعیت کا علم ہوتا تھا۔ ان کا علم انسانوں کو اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط کرنے، اچھے اخلاق اپنانے اور اپنی روح کی تطہیر کرنے کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کا علم محض دنیاوی علوم یا مادی معلومات تک محدود نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کا اصل جوہر ایک بلند روحانی اور اخلاقی علم ہوتا تھا جو دلوں کو منور کرتا، روحوں کو پاکیزگی عطا کرتا، اور انسانوں کو اعلیٰ انسانی قدروں کی طرف لے جاتا تھا۔ انبیاء کا پیغام صرف یہ نہیں تھا کہ انسان دنیا میں کیسے کامیاب ہو، بلکہ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ انسان اپنی تخلیق کے مقصد کو پہچانے، اللہ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کرے اور اخلاقی برتری حاصل کرے۔

روحانی علم وہ علم ہے جو انسان کو اپنے رب سے قریب کرتا ہے۔ یہ علم انسان کے دل و دماغ کو ایک ایسی روشنی عطا کرتا ہے جو اسے ظاہر کے پردوں سے ماورا حقیقتوں کی پہچان عطا کرتی ہے۔ انبیاء کے ذریعے انسان یہ سیکھتا ہے کہ محض جسمانی اور مادی ترقی کافی نہیں بلکہ اصل فلاح روحانی پاکیزگی، اللہ کی رضا، اور نیک کردار میں ہے۔ انبیاء دلوں کی اصلاح کرتے تھے اور انسان کے باطن کو سنوارتے تھے، تاکہ وہ صرف دنیاوی کامیابی پر نہ رکے بلکہ آخرت کی تیاری میں بھی مشغول ہو۔

اخلاقی علم انبیاء کی تعلیمات کا ایک مرکزی ستون تھا۔ انبیاء نے ہمیشہ سچ بولنے، عدل قائم کرنے، امانت داری، انکساری، رحم دلی، صبر، عفو و درگزر، اور حسنِ سلوک جیسے اخلاقی اصولوں کی تعلیم دی۔ ان کی تعلیمات میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی

انسان بہتر ہے جس کا اخلاق بہتر ہو۔ نبی کریم ﷺ نے خود فرمایا: (إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ)[1] بیشک مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اخلاق کے اعلیٰ درجے کو مکمل کر دوں۔

انبیاء کی بعثت کا ایک بڑا مقصد یہی تھا کہ انسان کے کردار کو سنوارا جائے، اور اسے ایک ایسا معاشرہ بنانے کی تربیت دی جائے جو عدل، محبت، اور ہمدردی پر قائم ہو۔ ان کی زندگیوں میں ہمیں عملی نمونے ملتے ہیں کہ کس طرح انسان نرمی، درگزر، اور تقویٰ کے ساتھ جیتا ہے۔ یہ روحانی اور اخلاقی علم ایسا خزانہ ہے جو نہ صرف فرد کی زندگی کو بدل دیتا ہے بلکہ پورے معاشرے میں امن، عدل اور خیر خواہی کو رائج کرتا ہے۔ انبیاء کی تعلیمات نے ہمیشہ قوموں کو ان کے زوال سے بچا کر فلاح و صلاح کی طرف رہنمائی کی ہے۔

3۔ ہدایت کا علم:

لہٰذا، انبیاء کا علم درحقیقت انسان کی روح کی تسکین، اس کے اخلاق کی تعمیر، اور اللہ سے اس کے تعلق کی مضبوطی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جو صرف کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی طرف سے دلوں پر نازل ہوتا ہے، اور جو صرف معلومات نہیں بلکہ حقیقی ہدایت اور روشنی فراہم کرتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے علم کا سب سے اہم اور بنیادی مقصد انسانوں کو ہدایت دینا تھا۔ ان کا علم محض نظریاتی یا علمی معلومات نہیں ہوتا تھا، بلکہ ایسا زندہ، بامقصد اور فعال علم ہوتا تھا جو انسان کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا تھا، جہالت سے علم کی طرف، گمراہی سے صراطِ مستقیم کی طرف، اور ظلمت سے نور کی جانب رہنمائی کرتا تھا۔ انبیاء کی تعلیمات انسانیت کے لیے چراغِ راہ کی مانند تھیں، جو ہر دور میں حق و باطل میں تمیز کا ذریعہ بنیں۔

انبیاء کو جو علم عطا ہوتا تھا، اس کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اللہ کے بندوں کو ان کے خالق و مالک کی طرف بلائیں، ان کو ان کی فطری ذمہ داریوں کا شعور دیں، اور انہیں بتائیں کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشہ نہیں بلکہ ایک عظیم امتحان ہے جس میں کامیابی اللہ کی رضا اور اس کے احکامات پر عمل میں پوشیدہ ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: (وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ

۱۔ مکارم الأخلاق، جلد ۱، صفحہ ۸، حدیث: ۳۷۳۴۵۳

رَّسُولًا أَنِ ٱعۡبُدُواْ ٱللَّهَ وَٱجۡتَنِبُواْ ٱلطَّٰغُوتَ)[1] اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ : اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔»

یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد انسانوں کو صرف مذہبی تعلیم دینا نہیں تھا، بلکہ ان کے قلب و باطن کو بیدار کرنا اور ان کی زندگی کے ہر پہلو کو اللہ کی ہدایت کے مطابق ڈھالنا تھا۔ انبیاء نے آکر انسانوں کو یاد دلایا کہ ان کا اصل مقصدِ حیات کیا ہے، اور انہیں ان راستوں سے بچایا جو تباہی اور گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

ہدایت کا یہ علم صرف الفاظ تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ انبیاء کی زندگی بذاتِ خود عملی نمونہ بن جاتی ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، اس پر خود عمل کرتے ہیں، اور اس عمل کی روشنی سے دوسروں کو راہ دکھاتے ہیں۔ ان کی صداقت، امانت، دیانت، صبر اور قربانی کی زندگی لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتی ہے، اور وہ جان لیتے ہیں کہ یہ علم محض انسان کا نہیں بلکہ اللہ کا پیغام ہے۔

ہدایت کا علم انسان کو صرف ایک مذہبی راستہ نہیں دکھاتا بلکہ وہ اسے دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس علم کے ذریعے انسان سچائی، عدل، تقویٰ، خیر خواہی، اور احسان جیسے اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس ہوتا ہے، اور اپنی ذات کے ساتھ ساتھ معاشرے کو بھی سنوارتا ہے۔ انبیاء نے ہمیشہ امتوں کو اپنے انجام سے خبردار کیا اور انہیں وقت پر متنبہ کر کے ان کی اصلاح کی کوشش کی۔

۴۔ غیب کا علم:

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم عطا ہوتا تھا، اس میں ایک نمایاں پہلو "علمِ غیب" بھی ہوتا تھا۔ غیب کا مطلب ہے وہ امور، حالات یا حقائق جو عام انسانوں کی نظر اور فہم سے مخفی ہوتے ہیں اور جن کا ادراک انسانی عقل، حواس یا سائنسی ذرائع سے ممکن نہیں ہوتا۔ انبیاء کو غیب کا علم اللہ تعالیٰ کی وحی یا الہام کے ذریعے عطا کیا جاتا تھا، اور یہ علم اس حد تک ہوتا تھا جتنی اللہ چاہتا، کیونکہ غیب کا علم فی نفسہ صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے : (عَالِمُ ٱلۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلَىٰ غَيۡبِهِۦٓ أَحَدًا، إِلَّا مَنِ ٱرۡتَضَىٰ

۱۔ سورۃ النحل ۱۶ : آیت ۳۶

مِن رَّسُول)[۱]، وہ غیب کا جاننے والا ہے، اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا، سوائے اس رسول کے جسے وہ پسند فرمائے۔"

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں، یعنی انبیاء، کو غیب کے بعض پہلوؤں پر مطلع فرماتا ہے، تاکہ وہ لوگوں کو مستقبل کے اہم حقائق سے آگاہ کر سکیں۔ انبیاء کو یہ علم اس لیے عطا کیا جاتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو ان خطرات، آزمائشوں یا فتنوں سے خبردار کریں جن کا انہیں سامنا ہو سکتا ہے، اور انہیں ان امور کے بارے میں رہنمائی دیں جن کا تعلق قیامت، جزا و سزا، آخرت یا دیگر روحانی حقائق سے ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو خوابوں کی تعبیر کا جو خاص علم عطا کیا گیا، وہ اسی علمِ غیب کی ایک صورت تھی۔ انہوں نے قید خانے میں قیدیوں کے خوابوں کی سچی تعبیر دی، اور بعد میں بادشاہ کے خواب کی ایسی تعبیر پیش کی جس نے مصر کی اقتصادی پالیسی ہی بدل دی۔ قرآن مجید حضرت یوسفؑ کے حوالے سے فرماتا ہے: "(وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ...)[۲] اور اسی طرح تیرا رب تجھے منتخب کرے گا اور تجھے خوابوں کی تعبیر سکھائے گا...

اسی طرح نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت کی نشانیاں، فتنہ دجال، جنت و دوزخ کی تفصیلات، حشر و نشر کے حالات، اور مختلف امتوں کے انجام سے متعلق غیبی معلومات عطا فرمائیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: (أوتيتُ مفاتيحَ كلِّ شيءٍ...)[۳] مجھے غیب کی کنجیاں دی گئی ہیں..."

یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اور جس قدر چاہے، اپنے نبیوں کو غیب کی خبریں عطا فرما سکتا ہے، اور ان کا یہ علم خالصتاً اللہ کے اذن سے ہوتا ہے، نہ کہ ان کی ذاتی صلاحیت کا نتیجہ۔ تاہم یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ انبیاء کا علمِ غیب محدود اور مشروط ہوتا ہے، اور وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا اللہ چاہتا ہے۔ وہ ہر غیب کو نہیں جانتے، بلکہ وہ علم ان کے مشن اور ذمہ داری کے مطابق مخصوص حدود میں ہوتا ہے۔

۱۔ سورۃ الجن ۷۲: ۲۶-۲۷

۲۔ سورۃ یوسف ۱۲: ۶

۳۔ الخصائص الکبری-رقم الحدیث أو الصفحۃ: ۲/۱۹۵-أخرجہ أحمد (۵۵۷۹) واللفظ لہ. وأخرجہ البخاري (۴۷۷۸) بلفظ: «مفاتيح الغيب خمس»

لہٰذا، غیب کا علم انبیاء کے علم کی وہ اعلیٰ ترین سطح ہے جو ان کے مقام کو ثابت کرتی ہے، اور لوگوں کے لیے یہ ایک دلیل بن جاتی ہے کہ وہ اللہ کے سچے پیغامبر ہیں۔ ان کی پیش گوئیاں، خوابوں کی تعبیریں، اور آخرت کے معاملات کی خبریں انسانوں کو ایمان، یقین، اور عمل کی طرف بلاتی ہیں۔

۵۔ معجزات کے ذریعے علم کا اظہار:

انبیاء علیہم السلام کے علم کی ایک نمایاں اور غیر معمولی خصوصیت یہ تھی کہ وہ علم صرف الفاظ یا تعلیمات کی صورت میں محدود نہ ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے معجزات کے ذریعے بھی ظاہر ہوتا تھا۔ یہ معجزات محض عجیب و غریب مظاہر نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان میں اللہ کی قدرت، نبی کی صداقت، اور ان کے علمِ الٰہی کی گہرائی کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ معجزہ دراصل ایک ایسا عمل ہوتا ہے جو انسانی فطرت، سائنسی قوانین اور عقلِ عامہ کے دائرے سے ماورا ہوتا ہے، اور جو صرف اللہ کے حکم سے نبی کے ہاتھ پر ظہور پذیر ہوتا ہے۔

انبیاء کے معجزات اس بات کا ثبوت ہوتے تھے کہ ان کا علم محض انسانی تجربے، سیکھنے یا مشاہدے کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست عطا کردہ تھا۔ معجزات لوگوں کے لیے ایک بصری دلیل ہوتے تھے، جو انہیں سچائی کو تسلیم کرنے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ کرتے تھے۔

قرآن مجید میں مختلف انبیاء کے معجزات بیان ہوئے ہیں جو ان کے علم اور اللہ کے پیغام کی سچائی کی نشانیاں ہیں:

◈ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عصا کا معجزہ عطا کیا، جو سانپ بن جاتا تھا، اور ان کا ہاتھ نورانی ہو جاتا تھا۔ یہ معجزے فرعون کے دربار میں ظہور پذیر ہوئے تاکہ باطل کو شکست ہو اور اللہ کی وحدانیت واضح ہو۔

◈ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردوں کو زندہ کرنے، مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دینے کا علم عطا کیا گیا، جو کہ محض طبی یا انسانی قوت سے ممکن نہیں تھا۔ یہ تمام معجزے ان کے الٰہی علم کی نشانیاں تھیں۔

◈ حضرت محمد ﷺ کو سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید عطا کیا گیا، جو تمام انسانیت کے لیے قیامت تک کے لیے ایک زندہ معجزہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد معجزے ظہور پذیر ہوئے، جیسے انگلی کے اشارے سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا (شق القمر)، پانی کا چشمہ بن جانا، کھانے کی قلت کے باوجود بہت سے لوگوں کا سیر ہو جانا، اور غیب کی باتوں کی پیش گوئی۔

معجزات کی یہ تمام صورتیں دراصل انبیاء کے علم کی عملی تصدیق تھیں۔ ان کے ذریعے یہ واضح ہوتا تھا کہ انبیاء کا علم روایتی یا محدود نہیں بلکہ وہ الٰہی سرچشمہ سے حاصل شدہ، کائناتی نظام پر اثر انداز ہونے والا علم ہے۔ معجزات نہ صرف ایمان والوں کا یقین مضبوط کرتے تھے بلکہ منکروں کو بھی دعوتِ فکر دیتے تھے کہ یہ انسان کا کام نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم طاقت (یعنی اللہ) ہے۔

معجزات کی ایک اور اہم حکمت یہ تھی کہ وہ صرف علم کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ تبلیغ کا ذریعہ بھی بنتے تھے۔ لوگوں کے دل ان مشاہدات سے متاثر ہوتے تھے، اور وہ انبیاء کی طرف متوجہ ہو کر اللہ کے دین کو قبول کرنے لگتے تھے۔

۶۔ پائیدار اور جامع علم:

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علم عطا کیا جاتا تھا، وہ نہ صرف سچائی پر مبنی ہوتا تھا بلکہ پائیدار، غیر متغیر اور ہمہ گیر بھی ہوتا تھا۔ ان کا علم وقتی یا محدود نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر زمانے کے انسانوں کے لیے روشنی کا مینار ہوتا تھا۔ انبیاء کا علم دنیا کے حالات، انسانوں کی ذہنی، روحانی، اور عملی ضروریات کو نہایت کامل انداز میں پورا کرتا تھا، اور یہی اس کی جامعیت اور دوام کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

انبیاء کا علم کسی فلسفی، سائنسدان، یا مفکر کے علم کی طرح تجربات یا مشاہدات سے پیدا نہیں ہوتا تھا جو وقت کے ساتھ تبدیل یا متروک ہو جائے، بلکہ یہ ایسا علم ہوتا تھا جو اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوتا، اور جس میں غلطی یا تضاد کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔

جیساکہ قرآن مجید میں ہے : (لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ) [1] باطل نہ اس کے آگے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یہ حکمت والے، لائقِ ستائش (اللہ) کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ "یہ آیت خاص طور پر قرآن کے بارے میں ہے، لیکن اس کا اطلاق تمام الہامی تعلیمات پر ہوتا ہے جو انبیاء کے ذریعے نازل ہوئیں۔ ان کا علم سچائی کا مظہر اور حق کی پہچان تھا، جس میں انسانوں کے لیے ہر طرح کی رہنمائی موجود تھی۔ حضرت محمد ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کی حیثیت سے مبعوث فرمایا تو ان کے ذریعے جو علم نازل ہوا، یعنی قرآن اور سنت، وہ نہ صرف جامع تھا بلکہ قیامت تک باقی رہنے والا تھا۔ یہ علم نہ کسی زمانے کی قید میں تھا، نہ کسی مخصوص قوم یا نسل کے لیے مخصوص تھا، بلکہ ہر نسل، ہر قوم، ہر علاقے اور ہر دور کے انسانوں کے لیے ایک مکمل ضابطۂ حیات تھا۔

آپ ﷺ کے علم میں عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تجارت، عدل، امن، بین الاقوامی تعلقات، خاندان، حتیٰ کہ جنگ کے اصولوں تک کی تعلیمات موجود ہیں۔ اس علم میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ موجود ہے، اور وہ ہر سوال کا واضح جواب فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات آج بھی ویسے ہی مؤثر، کارآمد اور قابلِ عمل ہیں جیسے آج سے چودہ سو سال پہلے تھیں۔ آپ کی سنت اور قرآن کی تعلیمات دنیا کے ہر خطے میں، ہر ثقافت میں، اور ہر طبقے کے لیے ایک جیسی مفید اور رہنمائی فراہم کرنے والی ہیں۔ اس کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا نظام یا علم نہیں دے سکتا۔ مزید یہ کہ انبیاء کا علم صرف ظاہری قوانین تک محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ روحانی و باطنی اصلاح کا بھی مکمل نظام ہوتا ہے۔ یہ انسان کے دل و دماغ، نیت و عمل، سوچ و کردار، سب کو پاکیزہ بنانے کی مکمل رہنمائی کرتا ہے۔

لہٰذا، انبیاء کا علم صرف وقتی رہنمائی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اور ان کے ذریعے دی جانے والی شریعت قیامت تک کے لیے کامل، جامع، اور ابدی ہدایت ہے۔

۱۔ سورۃ فصلت ۴۱ : ۴۲

۷۔ دینی علم:

انبیاء علیہم السلام کا علم بنیادی طور پر دینی اور شرعی نوعیت کا ہوتا ہے، یعنی ایسا علم جو انسان کو اس کے خالق، اللہ ربّ العزت، سے جوڑتا ہے، اور اس کی پوری زندگی کو ایک منظم، پاکیزہ اور خدا پسند طریقے پر استوار کرتا ہے۔ یہ علم محض نظری یا فکری نہیں بلکہ عملی ہدایت کا مجموعہ ہوتا ہے، جو انسان کے عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات اور معاشرت سب کو سنوارنے اور بہتر بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انبیاء کا دینی علم انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ:

- اللہ کون ہے؟
- اس کی عبادت کیسے کی جائے؟
- زندگی کو اس کی رضا کے مطابق کیسے گزارا جائے؟
- دنیا اور آخرت کی کامیابی کیسے حاصل کی جائے؟

یہ تمام سوالات کسی فلسفی، سائنسدان یا دنیاوی استاد کے علم میں نہیں ہوتے، بلکہ صرف نبی کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کے جوابات انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ قرآن مجید میں بارہا ذکر کیا گیا ہے کہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد دین سکھانا اور لوگوں کو پاک کرنا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے بارے میں فرمایا: (هُوَ ٱلَّذِى بَعَثَ فِى ٱلْأُمِّيِّـۧنَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِهِۦ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ)[1] وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔"

یہ آیت انبیاء کے دینی علم کے تین بنیادی ستونوں کو واضح کرتی ہے:

تلاوتِ آیات: یعنی اللہ کے کلام کو لوگوں تک پہنچانا۔

تزکیہ: یعنی باطنی پاکیزگی، نفس کا اصلاح، اور اخلاقی تربیت۔

تعلیمِ کتاب و حکمت: یعنی قرآن اور اس کی عملی حکمتیں (سنت) سکھانا۔

انبیاء کا دینی علم صرف عبادات جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج تک محدود نہیں ہوتا، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی مرضی کے مطابق رہنمائی فراہم کرتا ہے

۱۔ سورۃ الجمعہ ۶۲: ۲

جیسے :

- معاشی اصول (حلال وحرام، سود، تجارت)
- خاندانی نظام (نکاح، طلاق، وراثت)
- سماجی تعلقات (حقوق العباد، عدل وانصاف)
- اخلاقی رویے (صبر، شکر، عفو، تقوی)

دینی علم ہی انسان کو یہ شعور دیتا ہے کہ وہ دنیا میں محض حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ اس کی زندگی کا ایک بلند مقصد ہے : اللہ کی رضا حاصل کرنا۔ یہ علم انسان کو "عبد" یعنی بندگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچاتا ہے۔

دینی علم کی جامعیت کا بہترین نمونہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت میں موجود ہے۔ آپ نے نہ صرف اللہ کے احکام لوگوں کو پہنچائے بلکہ ان پر عمل کر کے دکھایا۔ آپ کی پوری زندگی قرآن کی عملی تفسیر تھی، جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا : (كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ)[1]

آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ انبیاء کا دینی علم ہی انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر راہِ ہدایت دکھاتا ہے، خواہ وہ ذاتی معاملہ ہو یا اجتماعی، انفرادی ہو یا حکومتی۔ یہی علم انسان کو رب سے جڑنے، اس کی رضا پانے، اور آخرت میں فلاح حاصل کرنے کا واحد ذریعہ فراہم کرتا ہے۔

۸۔ نیک اعمال کی تعلیم :

انبیاء کے علم کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ لوگوں کو اچھے اور نیک اعمال کی تعلیم دیتا تھا، تاکہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں اور اللہ کی رضا حاصل کر سکیں۔ ان کا علم لوگوں کو برے اعمال سے بچنے اور اچھے اعمال کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔

نوح (ع) نے اپنی قوم کے ساتھ یہ جملہ فرمایا : (أُبَلِّغُكُمْ رِسالاتِ رَبِّي وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لا تَعْلَمُونَ)[2]، میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں خدا کی طرف سے ایسی حقیقتوں کو جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ایک مربی اور ایک مبلغ کو فیاض اور ہمدرد ہونا چاہیے اور کافی علم اور آگاہی کا مالک ہونا چاہیے۔ (أَنْصَحُ لَكُمْ) نبی ﷺ کی شفقت اور ہمدردی ذاتی مفادات کے لیے نہیں

۱۔ مسند احمد، احمد بن حنبل، ج ۶، ص ۱۶۳ الطبقات الکبری، ابن سعد، ج ۱، ص ۲۷۳ مجموعۃ ورام (تنبیہ الخواطر)، ورام بن ابی فراس، ج ۱، ص ۸۹ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید : ج ۶ ص ۳۴۰

۲۔ اعراف ۷ : آیت ۶۲

بلکہ لوگوں کے مفاد کے لیے تھی۔ (أَنصَحُ لَكُمْ) انبیاء اپنے تمام علم و معرفت کا سرچشمہ خدا کو سمجھتے ہیں۔ (وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ) خدا کی طرف سے انبیاء کے پاس ایسا علم اور علم ہے جو انسانی ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ (وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ) یہ لفظ (مِنَ اللَّهِ) ظاہر کرتا ہے کہ انبیاء کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آزر کو بھی یہی تعبیر دی ہے۔ (يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ)[1] ترجمہ: بے شک میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا۔ قرآن کریم میں توحید اور قیامت پر عقیدہ اور زندگی کے منصوبوں اور معاشرتی قوانین کے بارے میں مختلف مضامین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ان مسائل کا علم صرف خدا کے پیغمبروں کو ہے اور لوگ ان مسائل کے بارے میں صرف شکوک و شبہات رکھتے ہیں، لہٰذا علم الٰہی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا علم الٰہی ہے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: (وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي فَضَّلَنَا عَلَى كَثِيرٍ مِنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِينَ)[2]، ہم نے داؤد اور سلیمان کو کافی علم دیا، اور انہوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے بندوں پر فضیلت دی اور حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: (وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا)[3] ترجمہ: اور لوط کو یاد کرو جسے ہم نے فیصلہ کرنے کی حکمت اور علم دیا تھا۔ اور پیغمبر اسلام کے بارے میں اللہ نے فرمایا: (وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ)[4] ترجمہ: اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کیا، اور آپ جو نہیں جانتے تھے وہ بھی سکھایا۔

انبیاء کے علم کے درجات:

انبیاء کے علم کے درجات اگرچہ مختلف ہوتے ہیں، لیکن ان سب کی بنیاد الہامی اور ربانی علم پر ہوتی ہے۔ ان کا علم انسانوں کو روشنی، فہم، اخلاق، اور روحانیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس کے زمانے، قوم، اور دعوت کے تقاضوں کے مطابق علم سے نوازا۔ نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء سے بلند درجے کا علم عطا کیا گیا، جو قیامت تک

۱۔ مریم ۱۹: آیت ۴۳
۲۔ نمل ۲۷: آیت ۱۵
۳۔ انبیاء ۲۱: آیت ۷۴
۴۔ نساء ۴: آیت ۱۱۳

کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ انبیاء کا علم ہمارے لیے ایک مشعل راہ ہے، جو ہمیں دین، دنیا اور آخرت کی کامیابی کی طرف رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انبیاء کے علم کے بارے میں، انبیاء کے علم کے درجات برابر نہیں ہیں۔ بعض انبیاء زیادہ علم رکھتے تھے۔ انبیاء میں سب سے اعلیٰ ہستی پیغمبر اسلام (ص) ہیں۔ خداتعالیٰ فرماتا ہے: (وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ)[1] ترجمہ: ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر ترجیح دی۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: (تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ)[2] ترجمہ: ہم نے ان میں سے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی۔ بعض انبیاء دوسروں سے افضل ہیں، ایسا نہیں ہے کہ تمام انبیاء ایک ہی درجے پر ہوں۔ نتیجہ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کو جو علم عطا کیا گیا، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص عنایت اور ہدایت کا ذریعہ تھا۔ یہ علم نہ صرف دینی احکام کی تبلیغ کے لیے تھا، بلکہ اس میں حکمت، بصیرت، اور غیب کی باتوں کا ادراک بھی شامل تھا، جیسا کہ حضرت یوسفؑ، حضرت سلیمانؑ، اور حضرت عیسیٰؑ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انبیاء کا علم، انسانیت کی رہنمائی، اصلاح، اور فلاح کے لیے ایک نور کی مانند تھا، جو جہالت اور گمراہی کے اندھیروں کو چیرتا ہوا راستہ دکھاتا ہے۔ قرآن ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ سچا علم وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو، اور انبیاء کو جو علم عطا ہوا، وہ نہ صرف ان کی صداقت کی دلیل ہے، بلکہ ہمارے لیے بھی رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ اس علم کے ذریعے انبیاء نے امتوں کی تربیت کی، عدل قائم کیا، اور لوگوں کو توحید کی طرف بلایا۔ نتیجتاً، انبیاء کا علم آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے، جو ہمیں سچائی، ہدایت اور خداشناسی کی طرف لے جاتا ہے۔ قران انبیاء کا علم مختلف درجات پر مشتمل ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور ضرورتِ ہدایت کے مطابق عطا کیا جاتا ہے۔ سب سے اعلیٰ درجہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جنہیں جامع، کامل اور روشن علم عطا کیا گیا۔

انبیاء علیہم السلام کا علم اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہوتا ہے، جو انسانی سوچ اور فہم سے بالاتر ہے۔ ان کا علم مقصدی، ہدایت انگیز اور نورانی ہوتا ہے، جو امت کو راہِ ہدایت دکھاتا ہے۔

۱۔ اسراء ۱۷: آیت ۵۵

۲۔ بقرہ ۲: آیت ۲۵۳

انبیاء کو دیے گئے علم کی عظمت کا صحیح اندازہ صرف اللہ ہی جانتا ہے، مگر ہمیں اس علم کے ذریعے ان کی اطاعت، محبت، اور ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ انبیاء کا علم محض ایک دنیاوی فہم یا فلسفہ نہیں بلکہ ایک الٰہی فیضان ہوتا ہے جسے "علمِ لدنی" کہا جاتا ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے، جو انبیاء کو اس لیے عطا کیا جاتا ہے تاکہ وہ انسانوں کو ہدایت، نجات، اور اللہ کی معرفت کی طرف لے جا سکیں۔ اس علم کی بنیاد وحی، حکمت، غیب کی خبر اور اصلاحِ خلق پر ہے۔ انبیاء کے علم کا منشاء اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کا مقصد انسانوں کو اللہ کی طرف بلانا، ان کی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کرنا، اور انہیں دنیا و آخرت کی فلاح کی طرف رہنمائی فراہم کرنا ہے۔

نتیجہ:

انبیاء علیہم السلام کا علم انسانیت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑی نعمت اور رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ یہ علم کسی دنیاوی نظامِ تعلیم، تجربے، فلسفے یا سائنس کی پیداوار نہیں بلکہ وحیِ الٰہی پر مبنی، پاک، اعلیٰ اور کامل علم ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد اللہ کی طرف سے عطا کردہ ہدایت، حکمت اور سچائی پر ہے، جس میں کسی شک یا تغیر کی گنجائش نہیں۔

انبیاء کا علم نہ صرف انسان کو اس کے رب سے جوڑتا ہے بلکہ اُسے زندگی کے ہر شعبے میں صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ یہ علم روحانی، اخلاقی، شرعی، دینی اور عملی تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ انبیاء کے علم کی خصوصیات جیسے کہ: براہِ راست وحی، ہدایت، غیب کا علم، معجزات، جامعیت، اور نیک اعمال کی دعوت۔ یہ سب مل کر ایک ایسے مثالی نظامِ ہدایت کو تشکیل دیتی ہیں جو دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

خاص طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ علم قیامت تک کے لیے مکمل اور پائیدار ہے، جو ہر نسل، ہر قوم، اور ہر فرد کے لیے راہِ نجات ہے۔ اس علم کے ذریعے انسان اپنی ذات کی اصلاح، سماج کی بہتری، اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ لہٰذا، ہمیں چاہیے کہ ہم انبیاء کی تعلیمات سے سبق لیں، ان کے علم کو اپنائیں، اور اپنی زندگی کو اسی روشنی میں ڈھالیں تاکہ ہم دنیا میں امن، اخلاق اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہوں، اور آخرت میں فلاح حاصل کر سکیں۔

منابع ومآخذ:

قرآن کریم
۱-ابن شہر آشوب، مناقب علی بن ابی طالب، بیروت، لبنان، تاریخ۱۹۸۵.
۲-جوادی آملی، عبداللہ، تفسیر موضوعی قرآن، ج۹، ص۱۷.
۳-سبحانی، آیہ اللہ جعفر، منشور جاوید، جلد۱۹، صفحہ ۱۸۹.
٤-شیرازی، ناصر مکارم، تفسیر نمونہ، جلد۱۰، صفحہ ۷۳.
۵- شیرازی، ناصر مکارم ، پیام قران، دارالکتب الاسلامیہ، تہران، چاپ۹، جلد۷، صفحہ ۲٤۷
٦-صدوق، محمد بن علی بن حسین، توحید، تہران، ایران، تاریخ۱۹۸۵.
۷- کلینی، محمد بن یعقوب، کافی، جلد۸، بیروت، لبنان، تاریخی۱۹٦٤ میلادی.
۸-مظفر، محمد حسین، کتاب علم امام (علیہ السلام)، ترجمہ محمد آصفی.
۹- مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، جلد۱۱، صفحہ ٤۸٤۹، بیروت، لبنان، تاریخ۱۹۸۳ میلادی.
۱۰-مفید، محمد بن نعمان، ارشاد، بیروت، لبنان، تاریخ۱۹۸۱ میلادی.

مظلوم کی حمایت اور ظالم کے خلاف جہاد نہج البلاغہ کی روشنی میں

محمد تقی قاضی

خلاصہ

جب سے دنیا خلق ہوئی ہے حق و باطل کی جنگ چل رہی ہے اور اس جنگ میں کچھ لوگ مظلوم واقع ہوتے ہیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ جس پر ظلم ہو رہا ہے کیا ہم تماشائی بن کر اس پر ہونے والے ظلم کو دیکھتے رہیں یا یہ کہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دینی ہوگی ۔ اس موضوع کا انتخاب اس لیے کیا گیا چونکہ دور حاضر میں اس کی اشدّ ضرورت کو محسوس کیا جا رہا ہے ، آج جدھر بھی نگاہ دوڑائیں ہر طرف ظلم اور ظالم اپنی جڑوں کو پھلائے نظر آتا ہے ۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جہاں ظلم اپنا رسوخ پیدا نہ کر چکا ہو۔ انسان گھر میں ہے تو ظلم ، باہر ہے تو ظلم ، جلوت میں ہو یا خلوت میں ہر جگہ ظالم بنا ہوا نظر آ رہا ہے گویا کہ ظلم کے شکنجے میں اس طرح قید ہو چکا ہے کہ جس سے چھٹکارے کا راستہ نظر نہیں آتا ۔ اب ایسے حالات میں صرف محمد و آل محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا کردار و گفتار ہی ہے کہ جو مشعل راہ بن کر انسیان کی ہدایت کر سکتا ہے اور اسے ظلم و ستم سے نجات دلا سکتا ہے ۔ لہذا اس تحقیق میں امام علی علیہ السلام کے کلام کی روشنی میں مظلوم کی حمایت اور ظالم کے خلاف جہاد کے بارے میں وضاحت پیش کی جائے گی ۔

کلیدی الفاظ : جہاد ، ظلم ، مظلوم ، نہج البلاغہ ، امام علی علیہ السلام

مقدمہ

خالق کائنات نے دنیا کی ہر شئی کو انسان کے لیے خلق کیا لیکن انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور جب انسان کو خلق کر چکا تو اسکو عقل و شعور کے زیور سے آراستہ بھی کیا اور اسکی ہدایت اور راہنمائی کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھی بھیجے لیکن آغاز خلقت انسان لیکر آج تک حق اور باطل کے درمیان جنگ جاری ہے۔ اور آج بھی۔ شیطان اور اسکے پجاری حق کے راستے میں رکاوٹ بنے کھڑے ہیں اور بے گناہ حق پرست مسلمان روزبہ روز ظلم کی چکی میں پسے جارہے ہیں زمانہ ماضی میں ظالم قوتیں قابیل، نمرود۔ شداد اور فرعون-کی شکل میں حق کے مقابلے میں آکر اپنی جھوٹی خدائی اور عارضی حاکمیت کے لئے دنیا میں بے گناہ لوگوں کا خون بہاتی رہیں اور آج بھی سامراجی اور طاغوتی طاقتیں بے گناہ مسلمانوں کو اپنے ظلم کا نشانا بنا کر فرعونیت اور نمرودیت کی یاد دلا رہی ہیں۔ لہذا ہم تمام مسلمانوں کا شرعی فریضہ ہے کہ ایسے ظالمون کی عارضی حکومت و خدائی کو بے اعتباری بنانے کے لئے میدان جہاد میں آئیں اور انکے خلاف جوابی کاروائی کریں جب کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں مسلمانوں کو ظالم کے خلاف میدان جہاد کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا: (أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُواْ وَإِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ)[1] یعنی جن لوگوں سے مسلسل جنگ کی جارہی ہے انہیں انکی مظلمویت کی بنا پر جہاد کی اجازت دیدی گئی ہے اور یقینا اللہ انکی مدد کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اسلام میں یہ پہلا اذن جہاد تھا جو سورہ حج میں وارد ہوا ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ ایک اشارہ ہے کہ حج اور جہاد میں کوئی منافات نہیں ہے اور حج کے اجتماع میں جہاد کا نعرہ لگایا جاسکتا ہے۔

ظلم اور عدل کے معنی:

ظلم کے معنی حق سے تجاوز کرنے اور اپنی حد سے اگے بڑھ جانے کے ہیں چاہے وہ حد شکنی کسی بھی طرح کی ہو اور عقلی لحاظ سے خداوند عالم کے بنائے ہوئے قوانین اور اصول و ضوابط کہ جو موجودات کے تکامل کے لیے ہیں ان سے انحراف بھی ظلم شمار ہوتا ہے۔

۱۔ سورہ حج ۲۲: آیت ۳۹

راغب اصفہانی کہتے ہیں ظلم اہل لغت اور بہت سے علماء کے نزدیک کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر کسی اور جگہ پر قرار دینے کو کہتے ہیں خواہ کمی کی صورت میں ہو یا زیادتی کی صورت میں ظلم ایک ایسا مفہوم ہے جو نہ صرف شرعی لحاظ سے بلکہ عقلی لحاظ سے بھی قابل مذمت ہے اسلئے کہ اگر ایک شخص کو سر عام بے دردی کے ساتھ مارا جا رہا ہو تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ شخص اچھا کام کر رہا ہے بلکہ ہر وہ انسان کے جو صاحب عقل سلیم ہوگا اور اس کے اندر تھوڑی سی بھی غیرت پائی جائے گی تو اگرچہ ظاہری اعتبار سے نہ سہی مگر دل سے اس امر کی ضرور ملامت کرے گا اور اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو خود اس کا ضمیر اس کی ملامت کرے گا ظلم کے مقابلے میں عدل اور انصاف ہے کہ جس کے معنی ہیں ہر شے کو اس کے مقام پر رکھنا یا ہر شے کو اس کا حق عطا کر دینا یا مولا متقیان علیہ السلام کے کلام کی روشنی کہ آپ نے فرمایا (العَدْلُ یَضَعُ الأُمُورَ مَوَاضِعَهَا)[1] یعنی ہر امر کو اس کے مقام پر رکھنا۔

یہ بات مسلم ہے کہ ظلم کسی بھی اعتبار سے قابل ستائش اور اچھا نہیں مگر بحث یہ ہے کہ کون ظلم کی زیادہ مخالفت کرتا ہے یوں تو ہر ایک ہی مدعی مخالف ظلم ہے لیکن اگر تاریخ انسانیت پر دقت نظر کیا جائے اور خاص کر اسلامی نظریات پر غور کیا جائے تو اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جتنا دین اسلام اور اس کے رہنماؤں نے ظلم کے خلاف آواز کو بلند کیا ہے اتنا کسی اور دین و مذہب میں یہ بات دیکھنے کو نہیں ملتی خداوند متعال کی طرف سے آنے والے رہنما کا کمال ہی یہ رہا ہے کہ نہ انہوں نے کسی پر ظلم کیا اور نہ ہی ظلم کو ایک لمحے کے لیے برداشت کیا اس لیے کہ جو بھیجنے والا ہے اس نے پہلے ہی اعلان کر دیا کہ:

(إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئاً وَلٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ)[2] خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ لوگ ہیں جو خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

لہذا جب بھیجنے والا ہر نقص و عیب اور ظلم سے پاک و منزہ ہے تو اب اس کے نمائندے کیسے ظلم کر سکتے ہیں کیونکہ اگر یہ ظلم کریں گے تو بات پھر اس پر آجائے گی شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اپنے بھیجے ہوئے ہادی کے بھی ہر طرح کے عیب و نقص اور ظلم سے مبرہ ہونے کا اعلان کر دیا اور ارشاد فرمایا: (لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ)[3] "یہ عھدہ ظالمین تک نہیں پہنچے گا"۔

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۴۲۹

۲۔ سورہ یونس ۱۰: آیت نمبر ۴۴

۳۔ بقرہ ۲: آیت ۱۲۴

چونکہ ظلم ایک عیب ہے لہذا الٰہی منصب دار وہی ہوگا جو ظلم سے پاک و پاکیزہ ہوگا چنانچہ خطیب نہج البلاغہ اپنے الٰہی عہد کا ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ ارشاد فرماتے ہیں : (وَ اللَّهِ لَأَنْ أَبِيتَ عَلَى حَسَكِ السَّعْدَانِ مُسَهَّداً أَوْ أُجَرَّ فِي الْأَغْلَالِ مُصَفَّداً، أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَلْقَى اللَّهَ وَ رَسُولَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ظَالِماً لِبَعْضِ الْعِبَادِ...)[1]. "خدا گواہ ہے کہ میرے لیے سعد ہے ان خاردار جھاڑی پر جاکر رات گزار دینا یا زنجیروں میں قید ہو کر کھینچا جانا اس امر سے زیادہ عزیز ہے کہ میں روز قیامت پروردگار اور اس کے رسول سے اس عالم میں ملاقات کروں کہ کسی پر ظلم کر چکا ہوں..."[2]

تقسیمات ظلم :

کلی اعتبار سے اگر ظلم کو تقسیم کیا جائے تو اس کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

۱۔ ظلم علی اللہ ۲۔ ظلم علی العباد ۳۔ ظلم علی ذاتہ

۱۔ ظلم علی اللہ: یعنی وہ حق جو خدا اور اس کے بندے کے درمیان ہیں انسان اس کی حق تلفی کرے یعنی اسے پورا نہ کرے مثلا نماز روزہ وغیرہ...

۲۔ ظلم علی العباد: یعنی وہ حقوق کہ جو انسانوں کے درمیان ہیں انسان اسے پورا نہ کرے مثلا کسی کو بے جا ستانا کسی کا مال غصب کر لینا امانت میں خیانت وغیرہ...

۳۔ ظلم علی ذاتہ: یہ وہ حقوق ہیں کہ جس کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اپنے نفس سے ہے مثلا اگر کسی نامحرم کو بری نگاہوں سے دیکھا تو اپنی انکھوں پر ظلم کیا اگر ذہن سے شیطانی منصوبہ اور خرافات سوچے تو ذہن پر ظلم کیا اسی طرح دیگر اعضاء و جوارح کہ اگر ان سے غلط کام لیا تو یہ خود اپنے اپ پر ظلم ہے اس لیے کہ جس مقصد کے تحت ان کو خداوند عالم نے ہمیں عطا کیا ہے اس کے بر عکس اور خلاف استعمال ہوئے۔

مولائے کائنات ارشاد فرماتے ہیں : (أَقَلُّ مَا يَلْزَمُكُمْ لِلَّهِ، أَلَّا تَسْتَعِينُوا بِنِعَمِهِ عَلَى مَعَاصِيهِ)[3]

"خدا کا سب سے مختصر حق یہ ہے کہ اس کی نعمت کو اس کی معصیت کا ذریعہ نہ بنایا جائے"۔

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۲۲۴ کا ایک حصہ

۲۔ ترجمہ اردو علامہ ذیشان جوادی

۳۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۳۳۰

مذکورہ بالا پہلی دو قسموں کو ظلم علی غیرہ اور آخری قسم کو ظلم علی نفسہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ظلم اپنی تمام تر قسموں کے ساتھ قبیح ہے اگرچہ ظلم کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اگر تامل سے کام لیا جائے اور غور و فکر کیا جائے تو ہر طرح کا ظلم ظلم علی نفسہ ہے کیونکہ ظلم کرنے کے بعد انسان عذاب الٰہی کا مستحق قرار پاتا ہے جب تک کہ توبہ نہ کرے یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ظاہرا دوسروں پر ظلم کیا مگر باطنا اور درحقیقت اپنے آپ پر ظلم کیا اسی بات کی طرف مولائے کائنات کا کلام بھی ہماری رہنمائی فرما رہا ہے ارشاد ہوا:

(لَا یَکْبُرَنَّ عَلَیْکَ ظُلْمُ مَنْ ظَلَمَكَ؛ فَإِنَّهُ یَسْعٰی فِی مَضَرَّتِهِ وَ نَفْعِكَ...)[1] "اور کسی ظالم کے ظلم کو بڑا تصور نہ کرنا کہ وہ اپنے کو نقصان پہنچا رہا ہے یعنی خود اپنے اوپر ظلم کر رہا ہے"

بہر حال ظلم اور حق تلفی چاہے جس طرح کی ہو اس کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے انسان سے مفر اختیار نہیں کر سکتا اور کتنے ہی ظلم ایسے ہیں کہ انسان کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا لہذا انسان کو ہمیشہ اپنے مالک سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیے اسی بات کی طرف مولائے متقیان دعائے کمیل میں ظلمت نفسی کہہ کر ہمیں متوجہ کر رہے ہیں۔

یہاں پر اس فقرے سے یہ تصور و گمان نہ پیدا ہونے پائے کہ معاذ اللہ مولائے کائنات کسی ظلم میں ملوث تھے جو اس طرح دعا فرما رہے ہیں نہیں ہرگز ایسا نہیں ہے مولا متقیان ایک الٰہی عہدہ دار ہیں جہاں ظلم کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا یہ ہم جیسے گنہگار اور ناقص انسانوں کے لیے تعلیم و تربیت کا مقام ہے کہ ہم اس طرح اپنے رب کی بارگاہ میں مناجات کریں ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کئی طرح کے ہیں چنانچہ اسلام اور اسلامی لٹیروں نے ہر طرح کے ظلم سے مقابلہ کرنے کے لیے الگ الگ طریقے بھی بتائے کہ جس درجے کا ظلم ہوگا اسی کے اعتبار سے اس کے خلاف جہاد ہوگا اگر ظلم صرف انسان کی اپنی ذات تک محدود ہے تو توبہ اور استغفار سے کام چل جائے گا لیکن اگر ظلم شرک اور کفر کی حدوں کو پار کرتا ہوا اتنا عظیم ہو جائے کہ صرف ظالم کی ذات تک محدود نہیں بلکہ بندگان خدا کی اذیت کا بھی سبب بن رہا ہو وہاں پر جہاد بھی اسی کے اعتبار سے ہوگا اور اب صرف توبہ سے کام چلنے والا نہیں بلکہ امام معصوم جیسی شخصیات کو اس کا سامنا کرنے کے لیے قیام کرنا پڑے گا۔

۱۔ نہج البلاغہ، خط نمبر ۳۱

مصادیق ظلم:

یہاں پر ہم بطور نمونہ چند موارد کو ذکر کر رہے ہیں کہ جن کو قرآن کریم نے ظلم سے تعبیر کیا ہے تاکہ گفتگو کو سمجھنے میں آسانی ہو:

۱. شرک: یعنی خدا کا شریک ٹھہرانا اور یہ ایسا گناہ ہے کہ جس کو قران کریم نے ظلم عظیم سے تعبیر کیا ہے: (... إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ)[۱] "بتحقیق شرک ظلم عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے"۔

۲. آیات الٰہی کی تکذیب: یعنی جو آیات و نشانی خدا کو جھٹلائے:

(... فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ...)[۲] "اس سے بڑا ظالم کون ہے جو ایات خدا کی تکذیب کرے اور حق سے منہ موڑ لے"

۳. حدود الٰہی کو توڑنا: حریم و حدود الٰہی کا پاس نہ رکھنے والا بھی ظلم کرتا ہے:

(... وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ)[۳] "جو حدود الٰہی سے تجاوز کر جائے کار اور ظالم ہے"۔

۴. قانون خدا کے خلاف حکم دینا: یعنی دستورات الٰہی کے خلاف حکم صادر کرنا ظلم ہے: (... وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ)[۴] "جو خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے خلاف حکم صادر کرے وہ ظالم ہے"۔

(۵) راہ حق سے منحرف کرنا: یعنی جو لوگوں کو راہ حق و حقیقت سے منحرف کرے راہ کرے ظلم کرتا ہے: (... أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ)[۵] آگاہ ہو جاؤ کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے (الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجاً ...)[۶] "اور ان پر کہ جو لوگوں کو راہ حق سے دور کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو راہ حق سے منحرف کر دیں"۔

۶. کفار کو ولی بنانا: یعنی جو ہا تھی بر حق کو چھوڑ کر کفار کو اپنا ولی و سرپرست قرار دے وہ

۱۔ سورہ لقمان ۳۱: آیت ۱۳

۲۔ سورہ انعام ۶: آیت ۱۵۷

۳۔ سورہ اعراف ۷: آیت نمبر ۴۴

۴۔ سورہ مائدہ ۵: آیت نمبر ۴۵

۵۔ سورہ ھود ۱۱: آیت ۱۸

۶۔ سورہ ھود ۱۱: آیت ۱۹

ظالم ہے : (... وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ)[۱] اور تم میں سے جو بھی کفار کو اپنا ولی بنائے بلا تردید وہ ظالم ہے"۔

۷. خدا پر جھوٹ باندھنا: خداوند متعال پر جھوٹ باندھنا بھی ظلم ہے : (وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللهِ الْكَذِبَ...)[۲] ۔ "اس سے بڑا ظالم اور ستم کار کون ہوگا کہ جو خدا پر جھوٹ اور بہتان باندھے"۔

۸. کتمان شہادت الٰہی: گواہی خدا کو چھپانا بھی ظلم ہے : (وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللهِ)[۳] "اس سے بڑا ظالم کون ہوگا کہ جو انبیاء کے بارے میں خدا کی گواہی کو چھپائے"۔

۹. لوگوں پر تجاوز کرنا: یعنی بندگان خدا کو ستانا اور ان کا حق تلف کرنا بھی ظلم ہے :
(إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ)[۴] "سرزنش اور ملامت کی راہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے کہ جو لوگوں پر ظلم و ستم کرتے اور زمین پر ناحق تجاوز کرتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

۱۰. عصیان و نافرمانی خدا: اس سلسلے میں متعدد آیات پائی جاتی ہیں کہ جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ گناہ کرنا اور معصیت خداوند انجام دینا ظلم ہے جیسے کہ یہ آیت کریمہ : (فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ)[۵] ۔ "بندوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں"۔

ظلم کے یہ مذکورہ مصادیق قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں جن کو قرآن نے ظلم اور اس کے انجام دینے والے کو ظالم کہا ہے۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا موارد میں ابتدا کے آٹھ مصادیق وہ ہیں کہ جن کا تعلق انسان اور خدا سے ہے۔ یہ وہ مظالم ہیں کہ جسے انسان خدا پر کرتا ہے۔ نویں نمبر کا تعلق اس ظلم سے ہے کہ جو ایک انسان دوسرے انسان پر روا رکھتا ہے اور آخری والے کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات سے ہے اور ہماری گفتگو اسی مورد کے بارے میں ہے جہاں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے۔

۱۔ سورہ توبہ ۹ : آیت ۲۳
۲۔ سورہ انعام ۶ : آیت ۲۱
۳۔ سورہ بقرہ ۲ : آیت ۱۴۰
۴۔ سورہ شوریٰ ۴۲ : آیت ۴۲
۵۔ سورہ فاطر ۳۵ : آیت ۳۲

علامات ظلم وظالم:

امیر المومنین کی ذات گرامی ظلم اور ظالم سے اس قدر بیزار ہے کہ آپ زندگی کے کسی شعبے میں بھی ظلم اور ظالم کو قطعا برداشت نہیں کرسکتے لہذا اپنے چاہنے والوں اور عقیدت مندوں کو علامات ظلم اور ظالم سے بھی باخبر کردیا اس سلسلے میں امام کے چند اقوال ملاحظہ فرمائیں :

۱۔ (أَنصِفِ اللهَ وَأَنصِفِ النَّاسَ مِنْ نَفْسِكَ، وَمِنْ خَاصَّةِ أَهْلِكَ، وَمَنْ لَكَ فِيهِ هَوًى مِنْ رَعِيَّتِكَ، فَإِنَّكَ إِلَّا تَفْعَلْ تَظْلِمْ)[۱] "اپنی ذات اپنے اہل وعیال اور رعایا میں جن سے تمہیں تعلق خاطر ہے سب کے سلسلے میں اپنے نفس اور اپنے پروردگار سے انصاف کرنا ایسا نہ کروگے تو ظالم ہوجاؤ گے"۔

یہ وہ خط ہے کہ جسے امام نے مالک اشتر کو اس وقت تحریر فرمایا کہ جب انہیں محمد ابن ابی بکر کے حالات خراب ہوجانے کے بعد مصر اور اس کے اطراف کا عامل (گورنر) مقرر فرمایا اور یہ عہد نامہ حضرت کے تمام سرکاری خطوط میں سب سے زیادہ مفصل اور محاسن کلام کا جامع ہے

مذکورہ بالا فقرہ میں امام نے ظلم کی یہ علامت بتائی کہ اگر کوئی شخص اپنے اہل وعیال اور لوگوں کے بارے میں خود اپنے اور اپنے رب کریم سے انصاف نہ کرے تو اس نے ظلم کیا ہے یعنی اگر ناانصافی سے کسی کے بھی سلسلے میں کام لیا تو یہ ظلم ہے اور ظالم کہتے ہی اسے ہیں کہ جو عدل وانصاف اور حق سے دور ہو۔

۲۔ (مَن بالَغَ فی الخُصُومَةِ أثِمَ، ومَن قَصَّرَ فيها ظُلِمَ)[۲] "جو لڑائی جھگڑے میں آگے نکل جائے وہ گنہگار ہوتا ہے اور جو کوتاہی کرے وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے یعنی لڑائی جھگڑے میں زیادتی کرنا اور اس بارے میں کوتاہی برتنا نشانی ہے ظلم ہے۔

۳۔ (الْحَجَرُ الْغَصِيبُ فِي الدَّارِ رَهْنٌ عَلَى خَرَابِهَا)[۳] "گھر میں ایک پتھر بھی غصبی ہو تو اس کی بربادی کے لیے کافی ہے"۔ یعنی اگر گھر بربادی اور ہلاکت کی ہوا دکھائی دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ظلم پر رکھی گئی ہے کیونکہ کیس ظلم اور ظلم کا انجام بہرحال بربادی ہے یعنی گھر کی بربادی نشانیاں ظلم ہے۔

۱۔ نہج البلاغہ، نامہ نمبر ۵۳
۲۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۲۹۸
۳۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۲۴۰

۴۔ (لِلظَّالِمِ مِنَ الرِّجَالِ ثلاثُ علاماتٍ: يَظلِمُ مَن فَوقَهُ بِالمَعصِيَةِ، ومَن دُونَهُ بِالغَلَبَةِ، ويُظاهِرُ الظَّلَمَةَ)[۱] "لوگوں میں ظالم کی تین علامات ہوتی ہیں اپنے سے بالاتر معصیت کے ذریعے ظلم کرتا ہے اپنے سے کم تر پر غلبہ اور قہر کے ذریعے ظلم کرتا ہے اور دوسری علامت یہ ہے کہ ظالم قوم کی حمایت کرتا ہے"

ظلم وستم سے ممانعت:

اس بحث میں حضرت علی علیہ السلام کے ان اقوال و فرامین کو پیش کریں گے جن میں امام نے لوگوں کو ظلم و تعدی سے منع فرمایا ہے چونکہ حضرت خود ایک الٰہی نمائندے ہیں کہ جو نہ ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم برداشت کرتا ہے جو خود بھی عادل ہے اور عدل و انصاف کا حکم بھی دیتا ہے (ان اللہ یامر بالعدل) لہذا امام نے بھی دنیا کے سامنے وہی الٰہی کردار پیش کیا چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ کردار علوی کا نمونہ دیکھیے کہ جب حضرتؑ کے سر پر ضربت لگی اور امام کا سر شگاف ہو چکا زخمی حالت میں بستر مرگ پر ہیں اور اب ایسے عالم میں آپ کے قاتل عبدالرحمن ابن ملجم کو مولا کے سامنے پیش کیا گیا تو سب سے پہلا جملہ کہ اس کے ہاتھ کھول دیے جائیں اور پھر فرمایا کہ اس کے لیے شربت لایا جائے مگر پھر بھی دیکھا کہ وہ ڈرا ڈرا سا ہے فرمایا خوف نہ کرو اور جب پوری طرح مطمئن ہو گیا تو صرف ایک سوال کیا کہ اے ابن ملجم! یہ بتا کیا میں تمہارا برا امام تھا؟ قاتل ہے مگر امام کے رحم و کرم کا نمونہ دیکھ چکا ہے اور گفتار و کردار علوی سے بخوبی آشنا ہے لہذا کوئی جواب بن نہ پڑا تو کیا کہے شرمندگی سے سر جھکا کر صرف یہی کہا کہ مولا آپ سے بہتر کون ہو سکتا ہے مگر میں کیا کروں کہ جس نے خود ہی اپنے سے جہنم کا انتخاب کر لیا ہو اسے کون روک سکتا ہے۔

یہاں بات صرف اسی مقام پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ اس کے بعد امام اپنے عزیز و اقارب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: (يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، لَا أُلْفِيَنَّكُمْ تَخُوضُونَ دِمَاءَ الْمُسْلِمِينَ خَوْضاً، تَقُولُونَ قُتِلَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ (قُتِلَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ)؛ أَلَا لَا تَقْتُلُنَّ بِي إِلَّا قَاتِلِي...)[۲] "اے اولاد عبدالمطلب یہ نہ دیکھوں کہ تم مسلمانوں کا خون بہانا شروع کر دو

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۳۵

۲۔ نہج البلاغہ، وصیت نمبر ۴۷

صرف اس نعرہ پر کہ امیر المومنینؑ قتل کر دیے گئے میرے بدلے میں صرف میرے قاتل کے علاوہ کسی اور کو قتل نہیں کیا جا سکتا"۔

بات یہاں پر بھی تمام نہ ہوئی بلکہ امامؑ نے : (تَقْتُلُنَّ بِي إِلَّا قَاتِلِي) کی بھی وضاحت فرما دی کہ میرے قاتل کو کس طرح اور کیسے قتل کرنا انتقام کی آگ میں کو بالائے طاق نہ رکھ دینا اور اور جابروں کا رویہ نہ اختیار کر لینا چنانچہ فرمایا : (انْظُرُوا إِذَا أَنَا مِتُّ مِنْ ضَرْبَتِهِ هَذِهِ فَاضْرِبُوهُ ضَرْبَةً بِضَرْبَةٍ؛ وَلَا تُمَثِّلُوا بِالرَّجُلِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ (صلى الله عليه وآله) يَقُولُ: إِيَّاكُمْ وَالْمُثْلَةَ وَلَوْ بِالْكَلْبِ الْعَقُورِ)[1]

"دیکھو اگر میں اس ضربت سے شہید ہو جاؤں تو ایک ضربت کا جواب ایک ہی ضربت ہے اور دیکھو میرے قاتل کے جسم کے ٹکڑے نہ کرنا کہ میں نے خود رسول اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ خبردار کاٹنے والے کتے کے بھی ہاتھ پیر نہ کاٹنا"

کون دنیا میں ایسا شریف النفس اور بلند کردار ہے جو قانون خدا کی سربلندی کے لیے اپنے نفس کا موازنہ اپنے دشمن سے کرے اور اعلان کر دے اگرچہ مالک نے مجھے نفس اللہ اور نفس پیغمبر صلی اللہ علیہ والہ وسلم قرار دیا ہے اور میرے نفس کے مقابلے کائنات کے جملہ نفوس کی کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن جہاں تک اس دنیا میں قصاص کا تعلق ہے میرا نفس بھی ایک ہی نفس شمار کیا جائے گا اور میرے دشمن کو بھی ایک ہی ضرب لگائی جائے گی تاکہ دنیا کو یہ احساس پیدا ہو جائے کہ سماج میں خون ریزی اور فساد کے روکنے کا صحیح راستہ کیا ہوتا ہے یہی وہ افراد ہیں جو خلافت الہیہ کے حقدار ہیں اور انہی کے کردار سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ انسانیت کا کام فساد اور اور خون ریزی نہیں ہے بلکہ انسان زمین پر فساد اور خون روزی کے روک تھام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کا منصب واقعی خلافت الہیہ ہے۔

۲۔ حضرت امام حسنؑ کو وصیت فرماتے ہوئے ایک خط میں یوں فرمایا : (لَا تَظْلِمْ كَمَا لَا تُحِبُّ أَنْ تُظْلَمَ)[2] "جس طرح تم ظلم کو اپنے اوپر پسند نہیں کرتے تم بھی کسی پر ظلم نہ کرنا"

۱۔ نہج البلاغہ خط نمبر : ۴۷

۲۔ نہج البلاغہ، خط نمبر : ۳۱.

۔مالک اشتر کو یوں تحریر فرماتے ہیں : (وَالتَّغَابِيَ عَمَّا تُعْنَى بِهِ مِمَّا قَدْ وَضَحَ لِلْعُيُونِ، فَإِنَّهُ مَأْخُوذٌ مِنْكَ لِغَيْرِكَ ...) "اور جو نگاہوں کے سامنے واضح ہو جائے اس سے غفلت نہ برتنا کہ دوسروں کے لیے یہی تمہاری ذمہ داری ہے اور عنقریب تمام امور سے پردے اٹھ جائیں گے اور تم سے مظلوم کا بدلہ لیا جائے گا"[۱]

۴۔اسی طرح مذکورہ نامے کے ایک اور حصے میں یوں فرمایا : (وَأَشْعِرْ قَلْبَكَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةِ، وَالْمَحَبَّةَ لَهُمْ، وَاللُّطْفَ بِهِمْ) "اور رعایا کے لئے مہربانی محبت اور رحمت کو دل کا حصہ بنالو اور خبر داران کے حق میں پھاڑ کھانے والے درندے کے مثل نہ ہو جانا"۔[۲]

واقعا انسانیت کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ مولا جو اپنے بنائے ہوئے گورنر کو اس طرح سے محبت اور الفت کی وصیت کر رہا ہے وہ امام خود کتنا مہربان اور رووٴف ہوگا اور اپنی رعایا سے کس قدر محبت سے پیش آتا ہوگا۔ مگر افسوس تو اسی بات کا ہے کہ دنیا نے اس کے فضل و کرم کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اسے اپنے ظلم کا نشانہ بنالیا۔

امام کے یہ چند کلمات تھے جنہیں یہاں ظلم سے نہی اور ممانعت کے سلسلے میں پیش کیا گیا اور اسی طرح سینکڑوں کلمات ہیں مگر ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ظلم و ظالم سے اعلان برائت :

امام علی علیہ السلام کے کلام میں ایسے جملات و فقرات بے شمار پائے جاتے ہیں کہ جہاں پر آپ نے ظلم اور ظالم سے اعلان برات اور بیزاری فرمائی ہے ؛چنانچہ جیسا کہ پہلے بھی عرض ہوا کہ اسلامی لیڈروں کا کمال کردار ہی یہ رہا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ظلم و تعدی سے کام نہیں لیا بلکہ ہمیشہ ظلم و ستم کے مد مقابل رہے گویا ان کی زندگی کا مقصد ہی ظلم اور ظالم کے خلاف جہاد کرنا رہا سیرت تمام ائمہ علیہم السلام کی بھی یہی رہی۔ خاص طور پر یہ پہلو امام علی علیہ السلام کی حیات طیبہ میں نمایاں طریقے سے دیکھنے کو ملتا ہے۔

محترم حجت الاسلام والمسلمین جواد نقوی دام لہ فرماتے ہیں کہ : "جنہوں نے علی علیہ السلام کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا رہنما مانا انہوں نے بہت ہی آسان کام کیا کہ ان کے ماننے

۱۔ نہج البلاغہ، خط نمبر : ۵۳، ترجمہ علامہ جوادی

۲۔ نہج البلاغہ، خط نمبر ۵۳، ترجمہ علامہ جوادی

والے کو نہ جنگ کرنی ہے نہ جدال کوئی کچھ بھی کرے ان کو کسی سے بھی کوئی مطلب نہیں ان کو تو صرف اپنی کرسی بچانی ہے اور حکومت چلانی ہے مگر جنھوں نے علیؑ کو اپنا قائد اور رہنما تسلیم کیا انھوں نے بہت ہی سخت کام کیا اور سنگین ذمہ داری اپنے اوپر لی اس لیے کہ علی علیہ السلام وہ ہے کہ جو نہ ظلم کے خلاف خاموش بیٹھتا ہے اور نہ ہی اپنے ماننے والوں کو چپ بیٹھنے دیتا ہے نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی کسی کو ظلم کرنے دیتا ہے لہذا اگر علی کی امامت میں رہنا ہے تو اپنے اندر بھی ظلم و ستم کے خلاف وہی نفرت پیدا کرنا ہوگی جیسا علی علیہ السلام چاہتے ہیں اپنے اندر کرنے کا وہی جوش وجذبہ پیدا کرنا ہوگا کہ جو شایان شان محبان علی علیہ السلام ہے۔

اسلام کو مالک اشتر سلمان فارسی ابوذر غفاری میثم تمار اور مختار ثقافی جیسے کردار کی ضرورت ہے کہ جو ظالم کی انکھوں میں انکھیں ڈال کر گفتگو کرے جو ایک پل بھی ظلم اور ظالم کے خلاف چین سے نہ بیٹھے جو ظلم کی بساط کو تہ بالا کردے لہذا یہی بات ہے کہ کبھی بھی حق والوں اور باطل کی پیروی کرنے والوں میں میل و میلاپ نہیں ہوسکتا کیونکہ ان میں زمین و آسمان جیسا فرق ہے حق پسند ظالم سے نفرت اور ظلم کو ناپسند کرتا ہے اور اہل باطل ظلم کو پسند کرتے ہیں یہ ظلم کو روکنا چاہتے ہیں جبکہ وہ ظلم کو فروغ دینا ہے حق اور باطل میں تضاد ہے جیسے کہ نور اور ظلمت۔ علم اور جہل۔ رات اور دن کہ جس طرح یہ تمام چیزیں باہم جمع نہیں ہوسکتیں، اسی طرح عدل وانصاف حق وحقیقت اور باطل پرست کے نمائندے بھی آپس میں کبھی اتفاق نہیں کرسکتے، مولا کائنات کے چند کلمات اس سے متعلق ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ (ایھاالمومنین) ایمان والو جو شخص دیکھے کہ ظلم و تعدی پر عمل ہورہا ہے اور برائیوں کی طرف دعوت دی جارہی ہے اور اپنے دل سے اس کا انکار کردے تو گویا کہ محفوظ رہے گیا اور بری ہوگیا اور اگر زبان سے انکار کردے تو اجر کا حقدار بھی ہوگیا کہ یہ قلبی انکار سے بہتر صورت ہے اور اگر کوئی شخص تلوار کے ذریعے اس کی روک تھام کرے تاکہ اللہ کا کلمہ بلند ہو جائے اور ظالمین کی بات پست ہوجائے تو یہی وہ شخص ہے جس نے ہدایت کے راستے کو پالیا ہے اور اس کے دل میں یقین کی روشنی پیدا ہوگئی ہے"[۱]

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۳۷۳ یا ۳۷۴

۲۔ اسی سے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا: (فَمِنْهُمُ ٱلْمُنْكِرُ لِلْمُنْكَرِ بِيَدِهِ وَلِسَانِهِ وَقَلْبِهِ) " بعض لوگ منکرات کا انکار دل زبان اور ہاتھ سب سے کرتے ہیں تو یہ خیر کے تمام شعبوں کے مالک ہیں اور بعض لوگ صرف زبان اور دل سے انکار کرتے ہیں اور ہاتھ سے روک تھام نہیں کرتے ہیں تو انہوں نے نیکی کی دو خصلتوں کو حاصل کیا ہے اور ایک کو برباد کر دیا ہے اور بعض لوگ صرف دل سے انکار کرتے ہیں اور نہ ہاتھ استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی زبان تو ان لوگوں نے دو خصلتوں کو ضائع کر دیا ہے اور صرف ایک کو پکڑ لیا ہے اور بعض وہ ہیں کہ جو دل زبان اور ہاتھ کسی سے بھی برائیوں کا انکار نہیں کرتے ہیں تو یہ زندوں کے درمیان مردوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور یاد رکھو کہ جملہ اعمال خیر جہاد در راہ خدا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقابلے وہی حیثیت رکھتے ہیں جو گہرے سمندر میں لواپ کے ذرہ کی حیثیت ہوتی ہے اور ان تمام اعمال سے بلند تر عمل حاکم ظالم کے سامنے کلمہ انصاف و حق کا اعلان ہے "[۱]

اسلام میں اس کی بہترین مثال ابن السکیت کا کردار ہے کہ جہاں متوکل نے ان سے یہ سوال کر لیا کہ تمہاری نگاہ میں میرے دونوں فرزند معتز اور معید بہتر ہیں یا علی علیہ السلام کے حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام۔ تو ابن السکیت نے ظالم سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا کہ: حسن و حسین علیہما السلام کا کیا ذکر ہے تیرے فرزند اور تو دونوں مل کر علی علیہ السلام کے غلام قنبر کی جوتیوں کی تسمہ کے برابر بھی نہیں ہو۔ جس کے بعد متوکل نے حکم دے دیا کہ ان کی زبان کو گدی سے کھینچ لیا جائے اور ابن السکیت نے نہایت درجہ سکون قلب کے ساتھ اپنی قربانی کو پیش کر دیا اور اپنے پیشرو میثم تمار، حجر ابن عدی، عمرو بن حمق، ابوذر، عمار یاسر اور مختار سے ملحق ہو گئے۔

مظلوم کا دفاع:

الٰہی نمائندوں کی خاصیت اور شیوہ یہ رہا ہے کہ انہوں دنیا میں آنے کے بعد باطل کا انکار کیا اور ساتھ ہی مظلوم طبقے کا دفاع بھی کیا چونکہ ہماری بحث کا محور نہج البلاغہ اور امام علی علیہ السلام کی ذات اقدس ہے لہذا آپ ہی کے کلام اور حیات طیبہ سے چند مثالیں مظلوموں کے حق کے دفاع کے سلسلے میں پیش کی جا رہی ہیں: راوی کہتا ہے کہ کوفہ کی گرمی شباب

۱۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۳۷۴ (نسخہ صبح صالح)، ترجمہ علامہ جوادی

پر تھی ایسے عالم میں میں نے امیر المومنین کو دیکھا کہ حضرت دیوار سے تکیہ کیے بیٹھے تھے میں نے کہا مولا اس گرمی کی شدت میں آپ یہاں کیوں اور کس لیے بیٹھے ہیں؟ فرمایا: میں گھر سے باہر آیا ہوں تاکہ مظلوم اور غم رسیدہ دل کی مدد کروں، تبھی میں نے دیکھا ایک عورت پریشانی کے عالم میں حضرت کے پاس آئی اور عرض کیا یا امیر المومنین میرے شوہر نے مجھ پر ظلم و ستم کیا ہے اور اس نے قسم کھائی ہے کہ مجھ کو مارے گا۔ امام نے تھوڑی دیر تک سر کو نیچا جھکائے رکھا اس کے بعد آسمان کی طرف بلند کر کے فرمایا: خدا کی قسم میں مظلوم کا حق دلوا کر رہوں گا۔ اور پھر اس عورت کے ساتھ چل پڑے اور اس کے گھر کے قریب پہنچ کر اہل خانہ اور اس کے شوہر کو سلام کیا، جب اس کا شوہر باہر آیا تو امام نے فرمایا: خدا سے ڈر کہ تو نے اپنی بیوی کو ڈرایا ہے۔ اس کے شوہر نے جواب دیا کہ تم کو میری بیوی سے کیا سروکار خدا کی قسم اب تمہارے اس کلام کی خاطر میں اسے نذر آتش کروں گا۔ امام کے چہرے پر جلالت کے آثار نمودار ہوئے تلوار کو نیام سے نکال کر فرمایا: میں تجھے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر رہا ہوں اور تو میری بات کو رد کر رہا ہے توبہ کر ورنہ میں تجھے ابھی قتل کر دوں گا۔ اتنے میں تمام لوگ جمع ہو گئے اور جب اس نے جان لیا کہ یہ کوئی اور نہیں بلکہ امیر المومنین ہیں تو حضرت کے قدموں پر گر کر عذر خواہی کرنے لگا۔ اس کے بعد امام نے اس عورت کے شوہر کو گھر میں جانے کا حکم دیا درحالیکہ اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے: (لا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ...)[1]

"پھر اس امر پر خدا کا شکر ادا کیا اس طرح کے خدا کا شکر ہے میرے ہاتھوں عورت اور اس کے شوہر کے درمیان صلح برقرار ہو گئی ہے" (سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۳۲۱۔)۔

اسی طرح کی متعدد مثالیں ہیں کہ جو حضرت کی حیات طیبہ میں دیکھنے کو ملتی ہیں مثلاً جب حضرت کسی شخص کو کسی بھی مقام کا عامل مقرر فرماتے تھے تو اس تو حضرت کا دستور اور طریقہ یہ ہوتا تھا کہ اس کے نام ایک خط تحریر فرماتے تھے کہ جس میں اس کو عدل و انصاف کی وصیت کی جاتی اور ظلم متعدی سے منع کیا جاتا تھا اور اگر کسی بھی وقت امام کو اس کے

۱۔ سورہ نساء ۴: آیت نمبر ۱۱۴

خلاف کوئی بات پتہ چلتی کہ مثلا اس نے لوگوں پر کسی طرح سے تجاوز کیا ہے فورا حضرت اس کے نام خط تحریر فرماتے کہ جس میں سخت لہجے سے کلام ہوتا تھا یعنی مقصد یہ تھا کہ علی کسی پر بھی ظلم و تعدی کو برداشت نہیں کر سکتا خواہ اپنا ہو یا پرایا خواہ ظلم کرنے والا محب ہو یا غیر محب حضرت کا ایک خط کہ جو بہت ہی مشہور و معروف ہے وہ مالک اشتر کو لکھا ہوا خط ہے اور یہ تمام خطوط میں سب سے تفصیلی اور بہترین خط شمار کیا جاتا ہے اس میں ایک جگہ اس طرح ارشاد فرمایا (وَلْيَكُنْ أَحَبَّ الْأُمُورِ إِلَيْكَ أَوْسَطُهَا فِي الْحَقِّ، وَأَعَمُّهَا فِي الْعَدْلِ...) تمہارے نزدیک پسندیدہ کام وہ ہونا چاہیے کہ جو حق کے اعتبار سے بہترین اور انصاف کے اعتبار سے لوگوں کو شامل اور رعایہ کی مرضی سے اکثر کے لیے پسندیدہ ہو مشاور کے بارے میں فرمایا دیکھو کسی حریص اور لالچی سے مشورہ نہ لینا کہ وہ ظالمانہ طریقے سے مال جمع کرنے کو بھی تمہاری نگاہوں میں آراستہ کر دے گا۔ وزارت کے سلسلے میں فرمایا دیکھو خبردار ان افراد کو اپنا وزیر نہ بنانا کہ جو پہلے اشرار کے وزیر رہ چکے ہوں اور ان کے گناہوں میں شریک رہے ہوں ان ظالموں کے مددگار اور خیانت کاروں کے بھائی بند وہیں لہذا ایسے افراد کا انتخاب کرنا کہ جو نہ کسی ظالم کے ظلم میں شریک ہوں اور نہ کسی گناہ کار کا اس کے گناہ میں ساتھ دیا ہو۔[۱]

ایک اور جگہ خرید و فروخت کے سلسلے میں ارشاد فرمایا: "لوگوں کو ذخیرہ اندوزی سے منع کرو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے اس سے منع کیا ہے خرید و فروخت میں سہولت ضروری ہے جہاں عادلانہ میزان ہو اور قیمت معین ہو جس سے خریدار یا بیچنے والے کسی فریق پر بھی ظلم نہ ہو"۔

ان مذکورہ بالا فقرات سے واضح ہوتا ہے کہ امام علی علیہ السلام چونکہ امام عادل ہیں لہذا ظلم کو کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتے گویا امام کا تمام تر مقصد حیات عدل و انصاف کا قیام، مظلوموں کا دفاع اور ظلم کے خلاف نبرد آزمائی رہا ہے۔

امام علی علیہ السلام کی نظر میں ظالم کے خلاف جہاد کی عظمت اور اس کی اقسام:

یوں تو تمام نمائندگان خدا کی یہ خاصیت رہی ہے کہ انہوں نے ظلم سے نبرد آزمائی کی اور

۱۔ نہج البلاغہ، خط نمبر ۵۳ سے اقتباس (ترجمہ علامہ جوادی)

اسکے خلاف آواز حق بلند کرتے رہے مگر مولائے کائنات کی ذات اقدس ان تمام میں نمایاں طور سے نظر اتی ہے کائنات کا ہر ہر قدم ظلم کے خلاف ایک جہاد ہے جسے امام تاحیات کرتے رہے، واضح رہے کہ صرف تلوار لے کر میدان جنگ میں جا کر دشمنوں کے خلاف لڑائی کرنا ہی جہاد نہیں بلکہ جہاد کی متعدد قسمیں ہیں جب جہاد تلوار کے ذریعے ہوتا ہے تو اسے جہاد بالسیف کہا جاتا ہے جب دشمن کے خلاف کلمہ حق قلم کے ذریعے لکھا جاتا ہے تو اسے جہاد بالقلم کہتے ہیں تقاریر اور خطبات کو ذریعہ بنایا جاتا ہے تو جہاد بالسان کہلاتا ہے جب دشمنوں کے خلاف مال و دولت صرف کیا جاتا ہے تو جہاد بالمال ہوتا ہے اور جب اپنے کردار عمل کے ذریعے نفس و خواہشات کا مقابلہ کیا جائے تو اسے جہاد بالنفس کا نام دیا جاتا ہے وغیرہ...۔
امیرالمومنین علیہ السلام کی تمام تر زندگی ظلم کے خلاف جہاد اور ایک تحریک کا نام ہے مولائے کائنات کے جہاد بالسیف کے گواہ بدر واحد و خیبر وخندق اور صفین و نہروان کے میدان ہیں جہاد بالسان کی گواہی خطبات و کلمات مولا دے رہے ہیں جہاد بالقلم کی گواہی خطوط و مرسلات دے رہے ہیں اپ کے جہاد بالمال کے گواہ وہ مساکین ہیں کہ جو اس در پر اکر بے زر سے ابوذر بن گئے اور جہاد بالنفس کا گواہ خود دشمن اسلام عمر ابن عبدود کا سر ہے۔

جب معاویہ کے لشکر نے انبار پر حملہ کیا ہے تو امیرالمومنین علی علیہ السلام نے جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے جہاد پر آمادہ کرتے ہوئے فرمایا: إنّ الجِهادَ بابٌ مِن أبوابِ الجَنّةِ فَتَحَهُ اللّهُ لِخاصَّةِ أوْليائِهِ، وهُوَ لِباسُ التَّقوى، ودِرْعُ اللّهِ الحَصينَةُ، وجُنَّتُهُ الوَثيقَةُ دوسری جگہ فرمایا: (فَمَنْ تَرَكَهُ (الجهاد) رَغْبَةً عَنْهُ أَلْبَسَهُ اللّهُ ثَوْبَ الذُّلِّ وَ شَمْلَةَ الْبَلاءِ وَ دُيِّثَ بِالصَّغارِ وَالْقَماءَةِ وَ ضُرِبَ عَلَى قَلْبِهِ بِالاسْهابِ وَ اُدِيلَ الْحَقُّ مِنْهُ بِتَضْيِيعِ الْجِهادِ وَ سِيمَ الْخَسْفُ وَ مُنِعَ النَّصَفُ)[1]
جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے پرودگار عالم نے اپنے مخصوص اولیاء

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

کے لئے کھولا ہے یہ لباس تقویٰ اور اللہ کی محفوظ و مستحکم زرہ ہے، اور جس نے جہاد سے اعراض کرتے ہوئے اسے نظر انداز کیا اللہ اسے ذلت کا لباس پہنا دے گا اور اس پر مصیبت حاوی ہو جائے گی اور اسے ذلت و خواری کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے گا۔ اس کے دل پر غفلت کا پردہ ڈال دیا جائے گا اور جہاد کو ضائع کرنے کی بنا پر حق اسکے ہاتھ سے نکل جائے گا اور اسے ذلت برداشت کرنا پڑے گی اور وہ انصاف سے محروم ہو جائے گا۔

مولائے کائناتؑ کے اس عظیم الشان خطبے سے معلوم ہوتا۔ کہ جب ظلم و بربریت اپنا سر اٹھانے لگیں تو لوگوں کو چاہے کہ وہ میدان جہاد میں آکر اس کا مقابلہ کریں اور کسی بھی حال میں ظالم کے ظلم کو نظر انداز نہ کریں۔ اسلام نے ظالم کے خلاف اس وقت تک جہاد کو واجب قرار دیا ہے جب تک جنگ کا قلع قمع نہ ہو جائے اور ظالم کے ہاتھ کٹ نہ جائیں اور دین فقط دین خدا نہ رہ جائے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ استعمار مسلمانوں کا دفاع کر رہا ہے اسی لئے وہ اسکی خوشنودی کے تانے بانے بنتے رہتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ظالم سے کسی حال میں بھی خیر کی امید نہیں رکھنی چاہئیے اس لئے کہ وہ ہر ظلم اور دنیا میں ہونے والے ہر فساد کی بنیاد ہے اگر اسکے اندر خیر کی کوئی دمک نظر بھی آجائے تو اس پر غور کرو کہ اسمیں اس کے لیے فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ بھیڑیا کبھی بھیڑ کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا اور اگر کوئی خیر خواہی دکھا دے سمجھ لو کہ وہ اپنے مستقبل کے درپے ہے جو آج نہیں تو کل ضرر و نقصان پہنچائے گا۔ جیسا کہ ایک مشہور ضرب المثل ہے دانتوں کو نکلا دیکھ کر یہ خیال نہ رہے کہ وہ ہنس رہا ہے بلکہ وہ تو موقع کی تلاش میں اور پوری طرح سے آمادہ ہے کہ شکار کو دبوچ لے۔ لہذا ہمیں ظالم کی شیطانی چالوں سے باخبر اور ہوشیار رہنا چاہیے اور اسکے خلاف ہمہ وقت جہاد کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے سن ۶۱ ہجری کے واقع میں امام حسینؑ نے معرکہ کربلا سر کر کے یہی تو پیغام ظاموں کے خلاف جہاد کرنے والوں کو دیا تھا کہ میدان جہاد میں اس وقت تک اپنے قدم پیچھے نہ ہٹانا جب تک کہ ظلم کے مناروں کو منہدم نہ کر دو۔ عصر حاضر کے حالات پر اگر غور کیا جائے تو یزید کی طرح آج بھی ظالم حکومتوں نے اپنی تمام تر قوتوں کو ایک مرتبہ پھر یک جا کر کے ظلم و جور کا ایک نیا بازار گرم کر رکھا ہے۔

لہذا ظالم سے نرم رویہ اختیار نہ کریں اور نئے نئے بہانے تلاش نہ کریں جس طرح ماضی کے مسلمانوں نے علی علیہ السلام کے ساتھ کیا کہ جب آپ نے لوگوں کو جہاد کی طرف دعوت دی تو کہنے لگے یا علی ع اتنی شدید گرمی ہے ، تھوڑی مہلت دیجئے تاکہ یہ گرمی گزر جائے اور اسکے بعد جب سردی میں جہاد کے لئے بلایا تو کہنے لگے کہ یا علی ع اتنی سخت سردی پڑ رہی ہے ذرا ٹھہر جائیں کہ سردی ختم ہو جائے حالانکہ دوستوں یہ سب جہاد سے منہ موڑنے اور میدان جنگ میں چمکتی ہوئی تلواروں سے جان بچانے کے بہانے تھے اس لئے کہ جو قوم سردی اور گرمی سے فرار کرتی ہے وہ میدان جہاد میں کہ جہاں صرف موت دیکھائی دیتی ہے کس قدر فرار کرے گی اور جب لوگوں نے جہاد سے بچنے کے لئے بہانے تلاش کرنا شروع کیے تو امیر المومنین ع نے ان لوگوں سے مخاطب فرمایا :

(يَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ، حُلُومُ الْأَطْفَالِ وَعُقُولُ رَبَّاتِ الْحِجَالِ، لَوَدِدْتُ أَنِّي لَمْ أَرَكُمْ وَلَمْ أَعْرِفْكُمْ مَعْرِفَةً وَاللَّهِ جَرَّتْ نَدَماً وَأَعْقَبَتْ سَدَماً. قَاتَلَكُمُ اللَّهُ لَقَدْ مَلَأْتُمْ قَلْبِي قَيْحاً وَشَحَنْتُمْ صَدْرِي غَيْظاً وَجَرَّعْتُمُونِي نُغَبَ التَّهْمَامِ أَنْفَاساً وَأَفْسَدْتُمْ عَلَيَّ رَأْيِي بِالْعِصْيَانِ وَالْخِذْلَانِ، حَتَّى لَقَدْ قَالَتْ قُرَيْشٌ إِنَّ ابْنَ أَبِي طَالِبٍ رَجُلٌ شُجَاعٌ وَلَكِنْ لَا عِلْمَ لَهُ بِالْحَرْبِ. لِلَّهِ أَبُوهُمْ! وَهَلْ أَحَدٌ مِنْهُمْ أَشَدُّ لَهَا مِرَاساً وَأَقْدَمُ فِيهَا مَقَاماً مِنِّي؟ لَقَدْ نَهَضْتُ فِيهَا وَمَا بَلَغْتُ الْعِشْرِينَ وَهَا أَنَا ذَا قَدْ ذَرَّفْتُ عَلَى السِّتِّينَ؛ وَلَكِنْ لَا رَأْيَ لِمَنْ لَا يُطَاعُ)[1]

"اے مردوں کی شکل و صورت والو اور واقعا نامردو : تمہاری فکر بچوں میں اور تمہاری عقلیں حجلہ نشیں عورتوں جیسی ہیں..."۔

ظالم کے ظلم کو نظر انداز نہ کیا جائے کیونکہ ظالم کے ظلم پر خاموش رہنا بھی ظلم ہے ۔لہذا ظلم کے خلاف اپنی کمر باندھیں ۔کیونکہ عصر حاضر میں ظالم حکومتیں چاہتی ہیں کہ مسلمانوں سے ان کے قبلہ اول بیت المقدس کو چھین لیں اور مسلمانوں کو ذلت ورسوائی کی عمیق دلدل میں دھکیل دیا جائے اور وہ ہاتھ پاؤں مار تے مارتے دم توڑ دیں اور ان کو یہ احساس نہ ہو کہ خود مرے ہیں یا مارے گئے ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

یہی وجہ ہے وہ آج بھی فلسطین کی وادیوں سے مظلوم بچوں کی درد بھری صدائیں ہمیں ظالم کے خلاف جہاد کے لیے آواز دے رہی ہیں وہ وقت آپہنچا ہے کہ ہم سب ملکر بیت المقدس کی حرمت کے لئے احتجاج کریں اور آواز بلند کریں تاکہ دنیا دیکھ کہ ہم ظلم کے خلاف ہیں ہم ظالم کے ساتھ نہیں ہیں ؟ خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ ہر گز ظالم کا ساتھ نہ دینا اور دیکھو ساتھ ظالم کی طرف میلان بھی نہ رہے اس لئے کہ اگر میلان بھی رہا تو جہنم کے شعلے تمہیں اپنی طرف کھینچ لیں گے ۔ میدان جہاد میں اترنے کے لئے یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ کتنے ہیں اس لئے کہ اسلام میں معیار جہاد کمیت نہیں ہے کیفیت ہے ۔ اگر حق پر بہتر ۷۲ بھی ہوں تو لاکھوں پر غالب کرنا خدا کا کام ہے ۔ تمہارا کام صرف خدا پر توکل کر کے میدان جنگ اور آتش آہن کی بارش میں کود جانا ہے آگ کو حق والوں کے لئے گلزار بنانا خدا کا کام ہے اور یہ درس واضح اور عملی طور پر کربلا سے ملتا ہے کہ جہاں امام حسین ع نے ظالم وقت کے خلاف عظیم الشان جہاد انجام دے کر اپنے چاہنے والوں کو بتایا کہ ظالم حکومتوں کو نابود کرنے کے لئے تعداد معیار نہیں ہے اگر بہتر ۷۲ ہو تب بھی نکل پڑو اور اس شان سے نکلو کہ دنیا دیکھے تو کہے کہ کلمتہ الحق کی بقا کے لئے اگر تیر بھی نکلتے ہیں تو لاکھوں پر محیط ہو جاتے ہیں ۔ اس لیے کہ راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جہاد کا رخ کرتے ہیں اور انکی نگاہ میں موت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ ذلت کی زندگی کے طلب گار نہیں ہوتے کہ اسے سرمایہ حیات سمجھیں اور نہ موت سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ اسے تعزیت کا موضوع قرار دیں انکی تمام تر کوشش اور فکر یہ ہوتی ہے کہ حق سربلند اور باطل سرنگوں ہو جائے اس کے نتیجہ میں انہیں جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے دنیا میں ہمیشہ دو طرح کے افراد پائے جاتے ہیں لوگوں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جنہیں ایمان عزیز ہوتا ہے اور جان عزیز نہیں ہوتی اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو اپنی چند روزہ زندگی کے لئے اپنے ابدی سرمائے ایمان کو اپنی جان پر قربان کر دیتے ہیں کہ جسکا نمونہ ہمیں جنگ صفین میں لشکر معاویہ اور لشکر مولائے کائنات کے درمیان نظر آیا لیکن افسوس یہ ہے کہ مولائے کائنات کے ساتھیوں نے بھی مولائے کائنات کے افکار کا ساتھ

نہ دیا اور صرف جنگ سے بچنے کے لئے معاویہ کے فریب کا شکار ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان آج تک تاریکی اور ظلمات سے دوچار ہو رہے ہیں اور اس کا ازالہ قیام قیامت تک نہ ہو سکے گا۔

یہ تو علی علیہ السلام کے اعلیٰ کردار کا کمال تھا کہ آپ نے نا کبھی کامیابی پر مسرت کا اظہار کیا اور نہ جنگ کی شکست پر کف افسوس ملتے ہوئے دکھائی دیتے بلکہ دونوں حالات میں یکساں دکھائی دیئے اور خدا سے یہی دعا کرتے نظر آئے کہ پروردگار ہمیں حق پر ثابت قدم رکھ اور ہر قسم کے فتنہ سے محفوظ رکھ۔ جہاد کا حسین ترین نقشہ یہی ہوتا ہے کہ جنت مجاہد کی نگاہ کے سامنے مثل دلہن کے نمایاں ہوتی ہے کہ جسکا وہ دل و جان سے فریفتہ ہوتا ہے جس کے اشتیاق میں وہ کسی بھی باطل اور ظالم طاقت کو نگاہوں میں نہیں لاتا اور ہنس کر جان دے دیتا ہے اور ظالم کے خلاف مجاہد کا یہ عمل تاریخ کے صفحات کی زینت بن جاتا ہے۔ لیکن اسکے بر عکس وہ لوگ جو جہاد سے دو قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں انکو تاریخ میں خراب اور بزدلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو تا ابد ایک ننگ اور عار ہے لہذا ہم تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ آپس کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر تسبیح کے دانوں کی طرح ہو جائیں اور اپنے دشمن کو پہچانیں اور انکے لیے صف ماتم بچھا دیں امام علی ع فرماتے ہیں:

(إيّاكَ و الدِّماءَ و سَفكَها بغيرِ حِلِّها؛ فإنّهُ ليسَ شَيءٌ أدنى لِنقمَةٍ، و لا أعظَمَ لِتَبِعَةٍ، و لا أحرى بِزَوالِ نِعمَةٍ، و انقِطاعِ مُدَّةٍ، مِن سَفكِ الدِّماءِ بِغَيرِ حَقِّها)[1] ناحق خون بہانے سے پرھیز کرنا کیونکہ زیادہ عذاب الہی سے قریب تر اور پاداش کے اعتبار سے شدید تر، اور نعمتوں کے زوال۔ زندگی کے خاتمے کے کے مناسب تر کوئی سبب نہیں ہے اور پروردگار روز قیامت اپنے فیصلہ کا آغاز خونریزیوں کے معاملہ سے کرے گا۔ لہذا اپنی حکومتوں کا استحکام ناحق خونریزی کے ذریعہ نہ پیدا کرنا اس لئے کہ یہ بات حکومت کو کمزور اور بے جان بنا دیتی ہے بلکہ تباہ کر کے دوسروں کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔

۱۔ نہج البلاغۃ: خط نمبر: ۵۳۔

ظلم وظالم کا سرانجام:

ظلم اور ظالم کا انجام بہت ہی خطرناک اور بھیانک ہے قران کریم نے متعدد انجام بیان کیے ہیں مثلا انتقام الہی[۱]، محرومیت از رحمت خدا[۲]، ضلالت وگمراہی[۳]، لعنت الہی[۴]، ہلاکت[۵] وغیرہ...

اس کے بعد قرآن نے ایک کلی پیغام انسانیت کو دیا کہ ہرگز یہ گمان نہ ہونے پائے کہ ظالمین جو عمل انجام دے رہے ہیں خدا ان سے غافل ہے۔ مگر چونکہ ہماری بحث نہج البلاغہ سے مختص ہے لہذا آئیے کلام امیر المومنین میں تلاش کرتے ہیں کہ حضرت نے ظلم کا کیا انجام بیان فرمایا ہے؛ چند کلام ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ (یَومُ العَدلِ علی الظّالِمِ أشَدُّ مِن یَومِ الجَورِ علی المَظلُومِ)[۶] "مظلوم کے حق میں ظلم کے دن سے شدید ظالم کے حق میں انصاف کا دن ہوگا"۔

۲۔ (بِئسَ الزادُ إلی المَعادِ العُدوانُ علی العِبادِ)[۷] "روز قیامت کے لیے بدترین زاد سفر بندگان خدا پر ظلم ہے"۔

۳۔ (لِلظَّالِمِ البَادِي غَداً بِكَفِّهِ عَضَّةٌ)[۸] "وہ شخص جو ظلم کی ابتداء کرتا ہے اسے ندامت و شرم کے مارے اپنی انگلی چبانا پڑے گا۔

ظالم کے سرانجام کے بارے میں یہ چند کلمات تھے کہ جن کو بطور نمونہ پیش کیا گیا وگرنہ اس کے علاوہ بھی متعدد کلمات ہیں لیکن اگر مذکورہ کلمات اور دیگر کلمات پر غور کیا جائے تو اس واضح ہوتا ہے کہ ظلم کا انجام بہت ہی شدید اور بدتر ہوتا ہے۔

۱۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُبِينٍ (سورہ حجر ۱۵۱۵: آیت ۷۹)

۲۔ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ (سورہ ھود ۱۱: آیت نمبر ۴۴)

۳۔ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ (سورہ ابراھیم ۱۴: آیت نمبر ۲۷)

۴۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ (ھود ۱۱: آیت نمبر ۱۸)

۵۔ وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا (سورہ کھف ۱۸: آیت نمبر ۵۹)

۶۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۳۳۴

۷۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۲۱۲

۸۔ نہج البلاغہ، حکمت نمبر ۱۸۶

ایک جملے میں خلاصہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظلم کا نتیجہ نہایت ذلت و خواری ندامت و پشیمانی ہلاکت بربادی اور تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اب جب ہر ظلم کرنے والے کا انجام یہ ہے تو پھر اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا جس نے عالم اسلام میں ظلم کی ابتدا کی ہے اور جس کے مظالم کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

نتیجہ:

امام علی علیہ السلام کے چند اقوال و فرامین تھے کہ جن کا اس تحریر میں مختصرا ذکر کیا گیا اور کلمات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ظلم کیا ہے؟ انسان کس طرح ظلم کو انجام دیتا ہے؟ اور پھر مولائے کائنات نے ظلم کو کس قدر حقیر اور پست بتایا اور ظالم کا انجام کیا ہوتا ہے؟ لہذا حضرت ہر ایک مقام پر لوگوں کو ظلم سے ممانعت کرتے ہوئے ظالم کے خلاف جہاد کرنے اور مظلوموں کے حق سے دفاع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اسی لئے فرمایا: ہمیشہ ظالم کے دشمن اور مظلوم کے حامی و مددگار رہنا مالک سے دعا کہ امام علی کے نقش قدم پر چلنے اور اپ کے اقوال و فرامین پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عنایت فرمائے تاکہ ہم امام کے واقعا چاہنے والے اور شیعہ کہے جانے کے قابل ہو سکیں۔

منابع

قرآن کریم

۱۔ ترجمہ و تفسیر قرآن اردو (انوار القرآن)، مولف سید ذیشان حیدر جوادی، چاپ لکھنو، تنظیم المکاتب. بی تا.

۲۔ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، مفردات الفاظ قرآن، المکتبہ المرتضویہ لاحیاء آثارا لجعفریہ، ۱۳۸۳.

۳۔ شریف رضی، نہج البلاغہ، تحقیق: صبحی صالح، قم، دارالہجرۃ، ۱۴۰۷ق.

۴۔ فیض الاسلام، سید علی نقی؛ نہج البلاغہ، بی نا، تہران، ۱۳۶۷ق.

۵۔ قمی، شیخ عباس، سفینۃ البحار و مدینۃ الحکم والآثار، چاپ: اسوہ، بی تا.

۶۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، بیروت، موسسہ الوفاء، ۱۴۰۴ہق.

قرآن کی رو سے، احسان اور (شاگرد۔مدار) تعلیمی ماڈل

Learner- Centered Education

سیّد شعیب عابدی، سید محمد رضا موسوی نسب

خلاصہ:

انسان کی سیکھنے کی صلاحیت مختلف عوامل سے متاثر ہوتی ہے۔ قرآن کریم تجرباتی اور معروف عوامل سے بڑھ کر ان امور کی بھی نشان دہی کرتا ہے جو سیکھنے اور تعلیم، خاص طور پر روحانی مسائل کے میدان میں، اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن کریم سورۂ یوسف کی آیت ۲۲ میں واضح طور پر فرماتا ہے: "چونکہ یوسفؑ محسنین میں سے تھے؛ لہذا ہم نے انہیں علم و حکمت عطا کی۔" یہ تحقیق توصیفی، تجزیاتی اور استنطاقی (موضوعی تفسیر) طریقہ کار کے ذریعے احسان کا تعلیم و تربیت میں جائزہ لیتی ہے۔ تحقیق کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے، پہلے خود نیک اور صالح انسان بنتا ہے پھر دوسرے کے ساتھ بھی نیکی اور بھلائی کرتا ہے، تو ایسے متقی انسان کا نفس الٰہی عنایات اور الہامات کے حصول کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ الٰہی عنایت عمومی ہے اور ہر محسن بندہ کے لیے میسر ہو سکتی ہے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اس نوعیت کا علم نہ صرف دنیاوی معاملات میں بلکہ روحانی معاملات میں بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس تحقیق کے نتائج سیکھنے والے کی مرکزیت والے تعلیمی ماڈل میں، بالخصوص علومِ تربیتی، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

کلیدی الفاظ: قرآن کریم، تربیتی نفسیات، احسان، نیکی، سیکھنا، شاگرد۔مدار تعلیمی ماڈل

مقدمہ:

تعلیم وتربیت میں کامیابی بہت سے عوامل سے وابستہ ہوتی ہے، جن میں سے ایک فعال و متحرک تعلیمی طریقہ کار ہے۔ تربیتی نفسیات میں ایسے طریقے متعارف کرائے جاتے ہیں جو شاگرد-مدار یا "سیکھنے والے کی مرکزیت والے تعلیمی ماڈل" کے نمونے پر مبنی ہوتے ہیں، جن میں استاد کی نگرانی اور رہنمائی کے ساتھ، سیکھنے والے طالب علم کی فعّالیت (Activity)، کام، تحرک وجنب وجوش پر زور دیا جاتا ہے۔

یہ ماڈل ایسے حالات، زمینہ اور علمی چیلنجز فراہم کرتا ہے جو سیکھنے والے کو متحرک کرتے ہیں اور یوں اُس کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں مدد دیتے ہیں۔ تربیتی نفسیات، تجرباتی طریقوں کے ذریعے، تعلیم وتربیت کے اس عمل کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کرتی ہے۔

قرآن کریم بھی وحی پر مبتنی منبع ہے۔ اس کا مقصد انسان کی ہدایت اور تربیت ہے۔ قرآنی آیات کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تجرباتی اور "سیکھنے والے کی مرکزیت والے تعلیمی ماڈل" کے طریقوں سے آگے بڑھ کر، ایسے روحانی اور اخلاقی طریقے بھی موجود ہیں جو تربیت کے عمل میں راہگشا ثابت ہوسکتے ہیں۔

یہ تحقیق اسی زاویے سے احسان کے کردار کو سیکھنے کے عمل میں بیان کرے گی۔ قرآن کریم کی آیات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کا اصل مقصد انسان کی ہمہ جہت تربیت اور نشوونما ہے؛ ایسا عمل جو صرف معلومات کی ترسیل سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ سیکھنے والے کو خود کوشش اور عمل کے ذریعے اس مقام تک پہنچانا ہوتا ہے۔

ایک مربی لکھتے ہیں: "کیا ہم نے جنبش و عمل کی ضرورت کو محسوس کیا ہے؟ مسئلہ یہ نہیں کہ کسی نے کہا اور ہم نے سن لیا، کسی نے لکھا اور ہم نے پڑھ لیا؛ بلکہ یہ احساس خود ہمارے اندر پیدا ہونا چاہیے۔ یہ احساس آسانی سے بہت سی چیزوں کے بارے میں ہمارے اندر پیدا ہوجاتا ہے۔ ہمیں پیاس لگتی ہے، ہم پانی چاہتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے اٹھتے ہیں، ملتے جلتے ہیں... صرف اس بنا پر کہ دوسروں نے کہا ہے: "پیاس"۔

ہمارے اٹھنے اور عمل کا سبب نہیں بنتا، اور اگر ہم چلیں بھی، تو وہ صرف تقلید ہوگی اور رکاوٹوں کے سامنے ہم پیچھے ہٹ جائیں گے۔ "لہٰذا سیکھنے کے عمل میں محض تعلیم دینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ شاگرد اور سیکھنے والے کے لیے ایسی فضا و گراونڈ مہیا کرنا بھی ضروری ہے جس میں وہ خود تحرک، جنبش اور فعالیت کی جانب راغب ہو۔

آج کے دور میں تعلیم و تربیت میں ان طریقوں پر زور دیا جا رہا ہے جو سیکھنے والے میں تخلیق (Creativity)، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت اور تنقیدی سوچ پیدا کریں۔ تاہم، یہ سب اچھا ہے لیکن کافی نہیں ہے۔ اگر سیکھنے والے کو اندر سے اس طرح متحرک کرنا ہے کہ اس پر علمِ الٰہی کی تجلی ہو، تو قرآنی نقطہ نظر اپنانا ناگزیر ہے تاکہ سیکھنے کے فراحسی (حسیات سے بالاتر) پہلو بھی روشن ہوں اور ایک اعلیٰ و ارفع تعلیمی ماڈل سامنے آئے۔ یہ زاویۂ نظر، موجودہ تربیتی علوم میں عموماً نظر انداز کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں مختلف حالات میں فعال سیکھنے کے طریقوں کے علاوہ، اخلاقی طریقے بھی موجود ہیں۔ اس تحریر میں بنیادی توجہ انہی پر مرکوز ہے۔ ان میں سے بھی صرف "احسان" کے طریقہ کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، اور درج ذیل سوالات پر غور کیا جائے گا:

۱. احسان اور روحانی و اخلاقی طور پر سیکھنے کے درمیان کیا تعلق ہے؟

۲. وہ علم جو محسنین کو عطا ہوتا ہے، کس نوعیت کا ہوتا ہے اور کس طرح حاصل ہوتا ہے؟

تحقیق کا طریقۂ کار:

یہ موضوع ایک طرف تعلیم و تربیت سے اور دوسری طرف قرآنی مباحث سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے یہ ایک بین الاضلاعی (Interdisciplinary) موضوع ہے۔

اس تحقیق میں توصیفی، تجزیاتی اور استنطاقی (موضوعی تفسیر) طریقے اپنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ، "قاعدۂ بطن گیری (آیات کی تأویل)" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، جس کے ذریعے زمانہ، مقام اور آیات کی ظاہری جزئیات کو عمومی خصوصیات سے الگ کرتے ہوئے ایک "قاعدہ کلیہ اور آخری مقصد" تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔

اس تحقیق کا طریقہ "نفسیاتی اور دینی" (یعنی دینی متون کی داخلی قرائت) ہے، جس میں قرآن کریم کی "تربیتی تفسیر" اور روایات پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔
یہ تحقیق قرآن کریم کی سیکھنے کے میدان میں اختراعی پہلو کو آشکار کرتی ہے اور اس کی روشنی میں قرآن کے تربیتی مقام کو واضح کرتی ہے، جس کی مدد سے تربیتی طریقوں کو بہتر بنانے میں مؤثر مدد مل سکتی ہے۔

ا۔ مفہوم شناسی:

اس تحقیق میں بحث میں داخل ہونے سے پہلے، مرکزی الفاظ جیسے: "احسان"، "تعلیم" اور "شاگرد-مدار تعلیمی ماڈل" کی تعریفوں کو نیچے بیان کیا گیا ہے۔

(الف). احسان: احسان لغت میں "حسن" سے ماخوذ ہے، جو برائی کے مقابلے میں اچھائی اور نیکی کے معنی دیتا ہے[۱]۔ "الحُسن" ہر وہ اثر ہے جو خوشی دینے والا ہو اور جس کی آرزو کی جائے۔ احسان کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم: دوسروں پر بخشش اور انعام دینا جیسے "أَحْسِنْ إِلَى فُلَانٍ[۲]: اس سے نیکی کرو"۔ دوسری قسم: عمل میں احسان کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اچھی تعلیم حاصل کرے یا اچھا عمل کرے؛
اور اسی بنیاد پر امیر المؤمنینؑ کا قول ہے: النّاس أبناء ما يُحْسِنُون[۳]؛ یعنی لوگ ان اچھے کاموں کی بنیاد پر پہچانے جاتے ہیں، جو وہ سیکھتے ہیں یا عمل کرتے ہیں[۴]۔
"حسن، قبح کا مخالف اور اس کا نقیض ہے۔ حقیقت میں، مجھ پر احسان اس وقت ہوا جب مجھے جیل سے آزاد کیا گیا۔ عرب کہتے ہیں: میں نے فلاں سے نیکی کی اور فلاں سے برائی کی، اور کہتے ہیں: ہم پر نیکی کرو اور ہم پر برائی نہ کرو[۵]"۔ اصطلاحی تعریف میں ہے: "دوسروں کو اس طریقے سے نفع پہنچانا کہ وہ اس پر آپ کی تعریف اور ستائش کرنے لگیں[۶]" اور "جب ایمان، اطاعت اور تقویٰ تک پہنچ جائے اور تقویٰ بھی صبر کے ہمراہ

۱۔ فراہیدی، ۱۴۰۹ق، ج۳، ص۱۴۳
۲۔ وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ترجمہ: نیکی کن همان گونه که خدا به تو نیکی کرده است (سورہ قصص۲۸: آیت نمبر ۷۷)
۳۔ کلینی، ۱۳۶۵، ج ۱، ص۴۸
۴۔ راغب، ۱۳۷۴، ج ۱، ص ۴۸۹و۴۹۲
۵۔ ابن منظور، ۱۴۱۴ق، ج ۱۳، ص ۱۱۴
۶۔ طوسی، بی تا: ۱۳۸/۶

ہوجائے، توانسان احسان کی حالت تک پہنچتا ہے : مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ[1]؛ (اگر کوئی تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔) وہ تقویٰ جو صبر کے ساتھ ہو، تجھے محسن بناتا ہے اور اللہ محسنین کے بدلے کو ضائع نہیں کرتا"۔ یعنی "آیت اور روایت کے مطابق، احسان تقویٰ سے بلند درجہ رکھتا ہے"۔

چنانچہ، احسان دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے : الف) نیک عمل بجالانا؛ جیسے نماز پڑھنا، روزہ رکھنا اور حج کرنا۔ ب) دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا یا ان کے مسائل حل کرنا۔ اس بنیاد پر، جو شخص نیک عمل لاتا ہے یا دوسروں کے ساتھ نیکی کرتا ہے، وہ محسن و نیک کہلاتا ہے۔

(ب) تعلیم: تعلیم (instruction) کا مطلب ہے عمل میں سکھانا، سکھانا، پڑھانا، تربیت کسی چیز کو بار بار دہرانا تاکہ اس کا اثر طالب علم کے اندر، اس کے نفس پر پڑے۔ اصطلاحاً سکھانے کیلئے، وہ سرگرمیاں جو پیشگی منصوبہ بندی کے تحت کی جاتی ہیں۔، یہ عمل باہمی تعاون کے طور پر بھی انجام دیا جاتا ہے (سیکھنے اور سکھانے والے کے درمیان) اس ذریعے، پائیدار اور مطلوب تبدیلی لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۲۔ شاگرد مدار تعلیمی ماڈل (Learner Centered Education)

سب سے پہلے شاگرد-مدار تعلیمی ماڈل کو تعلیمی نفسیات کے نقطہ نظر سے اور پھر قرآنِ کریم کی روشنی میں بیان کیا جائے گا۔

(الف)۔ شاگرد مدار تعلیمی ماڈل، علم نفسیات تعلیم کی رو سے:

سکھانے والا (استاد) اور سیکھنے والا (طالب علم)، تعلیم و تربیت کے دو بنیادی عوامل ہیں۔ ان کے کردار کے پیشِ نظر، دو مختلف نمونے (ماڈلز) متعین کیے جاتے ہیں۔ اگر سکھانے والے کا کردار سیکھنے والے کے مقابلے میں زیادہ فعال ہو، تو اسے "استاد مدار تعلیمی ماڈل" (Teacher Centered Education) کہا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر لیکچر کے طریقے سے چلایا جاتا ہے، سیکھنے والا سست ہوتا ہے۔ اور اگر سیکھنے والے شاگرد کا کردار سکھانے والے استاد کے مقابلے میں زیادہ فعال ہو، تو یہ "شاگرد-مدار

۱۔ سورہ یوسف ۱۲: آیت نمبر ۹۰

تعلیمی ماڈل" ہے۔ اس نمونے میں، سیکھنے والا علمی مواد کو قریب سے سمجھتا ہے اور فطری طور پر تعلیمی نتائج تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، اگرچہ اس قسم کے نمونے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اضافی صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

«شاگرد- مدار تعلیمی ماڈل «تربیتی نفسیات کی ایک اصطلاح ہے کہ جس میں «طلباء استاد کی مدد سے علمی مواد کو سمجھنے اور اس کی تفہیم کی ذمہ داری خود اٹھاتے ہیں۔ اس کو غیر مستقیم تعلیم (In direct Education) بھی کہا جاتا ہے، جو ان اساتذہ کے لیے موزوں ہے جو علمی مواد کو طلباء کے اندر سے نکالنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، یہ اساتذہ طلباء کو ایسے تجربات یا معلومات فراہم کرتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ خود نتائج اخذ کر سکیں»[۱]۔

«سیکھنا اور علم حاصل کرنا محض رٹنے اور حفظ کرنے سے کہیں آگے کا عمل ہے۔ اس مقصد کے لیے کہ طلباء واقعی سمجھ سکیں اور اپنے علم کو عملی طور پر استعمال کر سکیں، ضروری ہے کہ وہ علمی مسائل حل کرنے پر کام کریں، خود مسائل کی تشخیص کریں، تحقیق کریں اور علمی تصورات کے ساتھ عملی طور پر بھی کام کریں»[۲]۔

تربیتی نفسیات میں شاگرد—مدار تعلیمی و تدریسی طریقوں کی تعداد بنیادی طور پر ۱۷ ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱. تحقیقی طریقہ (استاد کی نگرانی میں منظم اکادمک طریقہ)؛ ۲. شاگرد کو مسئلے سے روبرو کرنے کا طریقہ (طالب علم کو چیلنجز میں ڈالنا تاکہ اس کی سوچ کو تحریک ملے)؛ ۳. علم کو (شاگرد کی ذات سے) مربوط کرنا اور معنی خیز بنانے کا طریقہ (طالب علم میں مطلوبہ علم کے لیے تجسس پیدا کرنا تاکہ وہ ذاتی دلچسپی سے آگے بڑھے)؛ ٤. باہمی گفتگو (گروپ ڈسکشن) کا طریقہ (مختلف آراء رکھنے والے افراد کے درمیان مکالمہ)؛ ٥. طالب علم کی سوچ بچار کی صلاحیت کو استعمال کرنے کا طریقہ (تحقیقی موضوعات اور متون کے سامنے مختلف سوچنے کے انداز اپنانا) ٦؛. اشتراکی طریقہ (طالب علموں کا ایک دوسرے کے

۱۔ سیف، ۲۰۱۱، ص ۵۲۴

۲۔ دیکھیں: اسلاوین، ۲۰۰٦، ص ۲۹۵

ساتھ اور استاد کے ساتھ علمی تعاون، نیز تحقیقی گروپس کا باہمی اشتراک)؛ ۷. شاگردی کا طریقہ (ایک غیر ماہر طالب علم کو کسی زیادہ ماہر طالب علم کے ساتھ بٹھانا تاکہ اس کاروائی (Process) میں، وہ سیکھ سکے)؛ ۸. سائنسی دورے کا طریقہ (کلاس سے باہر تجرباتی اور عملی مطالعہ جس میں طالب علم براہِ راست مسئلے کا جائزہ لیتا ہے)؛ ۹. منابع و مراکز سے رجوع کرنے کا طریقہ (معلومات لینا اور اور ان کا تجزیہ کرنا)؛ ۱۰. خود تنظیمی کا طریقہ (طالب علم اپنے خیالات، جذبات اور رویوں کو منظم طور پر اپنے مقاصد کے حصول کی طرف ہدایت کرتا ہے)؛ ۱۱. خالص دریافت پر مبنی سیکھنے کا طریقہ (استاد نہ تو مسئلے کے تصورات و اصول بتاتا ہے اور نہ ہی حل، بلکہ طالب علم کو مکمل آزادی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی طریقے سے مسئلے کا حل دریافت کرے)؛ ۱۲. ہدایت شدہ دریافت کا طریقہ (استاد کے سوالات اور رہنمائی کی مدد سے طالب علم مطلب کو سمجھتا ہے)؛ ۱۳. اوپر سے نیچے کی تعلیم کا طریقہ (پیچیدہ کاموں یا مسائل سے شروع کرنا اور پھر طالب علموں کو انہیں حل کرنے دینا)؛ ۱۴. تشکیلی تشخیص کا طریقہ (طالب علم کا کام کرنا اور استاد کا اس کی ذہنی سطح کے مطابق رسمی یا غیر رسمی طریقوں سے تشخیص کرنا)؛ ۱۵. تجرباتی طریقہ (عملی تجربہ حاصل کرنا، عام طور پر لیب میں)؛ ۱۶. یونٹ کام یا پراجیکٹ کا طریقہ (کلاس سے باہر تحقیقی سرگرمی)؛ ۱۷. کانفرنس کا طریقہ (علمی موضوع کو پیش کرنا جس پر بحث ہوتی ہے)[1]۔

(ب)۔ قرآن کریم میں، شاگرد۔مدار تعلیمی ماڈل:

قرآن کریم میں سیکھنے والے شاگرد-مدار تعلیمی ماڈل استعمال ہوا ہے؛ لیکن نہ اس معنی میں جو علم نفسیات میں پایا جاتا ہے۔ علم نفسیات کی بنیاد انسان مداری پر ہے جس میں خالق کا تصور، ماورائی طریقے اور غیر مادی ذرائع جیسے روح، الہام، فرشتے وغیرہ شامل نہیں ہیں۔ جبکہ قرآن کریم میں شاگرد-مدار تعلیمی ماڈل اسلام، ایمان، تقویٰ اور تزکیہ نفس کے زیر اثر ایک بلند تر معنی اختیار کرتا ہے اور اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔

۱۔ سیف، ۲۰۱۳، ص ۲۳۰؛ شریعتداری، ۲۰۱۱، ص ۱۱۱؛ کدیور، ۲۰۱۳، ص ۱۹۹؛ کاردان، ۲۰۱۱، ص ۲۷۲؛ سیف، ۲۰۱۱، ص ۵۳۴...؛ عابدی، ۲۰۱۹، ص ۱۷۵-۱۸۷

ان طریقوں میں کچھ عمومی طریقے ایسے ہیں جو علم نفسیات اور قرآن کریم میں مشترک ہیں اور زیادہ تر ذہنی تصورات سے متعلق ہیں اور انسان کے پانچ حواس سے کام لیتے ہیں۔

(الف)۱: شاگرد۔ مدار تعلیمی ماڈل کے مشترک عمومی طریقے:

قرآن کریم میں سیکھنے والے کو سرگرم عمل کرنے کے لیے، متعدد تجرباتی طریقے استعمال کیے گئے ہیں، جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱. سوالات کا سامنا کرانے کا طریقہ: أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ؛ کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں؟[۱]

۲. مجمل بیان کا طریقہ: أَقِمِ الصَّلَاةَ ؛اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو۔[۲]

۳. مشاورتی اور گفت و شنید کا طریقہ: وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ ؛ اور اپنے معاملات باہمی مشاورت سے انجام دیتے ہیں۔[۳]

٤. مشاہدے اور غور و فکر کے لیے عملی موقع فراہم کرنے کا طریقہ؛ أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ؛ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ دیکھ لیتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا؟[۴]

۵. مسئلے کے مطابق تحقیقی کام پر ابھارنے کا طریقہ: يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ؛ اے میرے بیٹو! جاؤ یوسف اور اس کے بھائی کو تلاش کرو۔[۵]

٦۔ منطقی دلائل کے ساتھ آرا کے تبادلے کا موقع فراہم کرنے کا طریقہ: جَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ؛ اور ان سے بہتر انداز میں بحث کریں۔[۶]

۷-ہدایت شدہ دریافت کا طریقہ: وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى..؛ اور (وہ واقعہ یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا تھا: میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔[۷]

۱۔ سورہ الغاشیہ ۸۸: آیت نمبر ۱۷
۲۔ سورہ لقمان ۳۱: آیت نمبر ۱۷
۳۔ سورہ الشوریٰ ۴۲: آیت نمبر ۳۸
۴۔ سورہ غافر ۴۰: آیت نمبر ۲۱
۵۔ سورہ یوسف ۱۲: آیت نمبر ۸۷
٦۔ سورہ النحل ۱٦: آیت نمبر ۱۲۵
۷۔ سورہ البقرہ ۲: آیت نمبر ۲٦۰

۸- مسئلہ یا سوال پیش کرکے ،اس کا حل، سیکھنے والے کی ذمہ داری پر چھوڑنے کا طریقہ (تقابلی) هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ؛ کہدیجئے : کیا بینا اور نابینا برابر ہوسکتے ہیں ؟ کیا تاریکی اور روشنی برابر ہو سکتی ہیں ۔[۱]

۹- علمی مصادر کی طرف رجوع کرنے کا طریقہ : فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ؛ پس انسان کو اپنے طعام کی طرف نظر کرنی چاہیے ۔[۲]

۱۰-شاگردی کا طریقہ : لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ؛ بتحقیق تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے ۔[۳]

اور دیگر طریقے جو تفصیل کے ساتھ اپنی جگہ پر بیان کیے گئے ہیں ۔[۴]

(ب)۲۔ قرآن کریم میں شاگرد ۔ مدار تعلیمی ماڈل کے مخصوص طریقے (احسان):

قرآن کریم تمام انسانوں کی عمومی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے : هُدًى لِّلنَّاسِ[۵] ، لیکن بعض آیات میں خاص طبقات کے لیے اپنی خصوصی ہدایت کو بھی رکھا ہے؛ جیسے متقین[۶]، مومنین[۷] اور محسنین[۸] ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عام لوگوں میں "اس طبقہ نے خدا کی خصوصی اور اعلیٰ درجات کی ہدایت کے حصول کی زیادہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کی ہے[۹] " ۔ انسان اپنے اندر جتنی زیادہ صلاحیت پیدا کرے گا، اتنی ہی زیادہ ،الٰہی ہدایت اس کا مقدر بنے گی : "اور ہر شخص کے لیے اس کے اعمال کے مطابق درجات ہوں گے اور آپ کا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے[۱۰] ۔ ان میں احسان کو اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے ۔

ہم اس موضوع کو اس آیت اور قرآن کی دیگر آیات کے مطالعہ سے مزید سمجھنے کی کوشش کریں گے ۔

۱۔ سورہ رعد۱۳ : آیت نمبر۱۶

۲۔ سورہ عبس : آیت نمبر۲۴

۳۔ سورہ احزاب : آیت نمبر۲۱

۴۔ ملاحظہ کریں : عابدی، ۲۰۱۹، ص ص ۱۸۷

۵۔ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ترجمہ : جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل کے امتیاز کی واضح نشانیاں موجود ہیں (سورہ البقرہ ۲ : آیت نمبر ۱۸۵)

۶۔ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ یہ صاحبانِ تقویٰ اور پرہیزگار لوگوں کے لئے مجسم ہدایت ہے (سورہ البقرہ ۲ : آیت نمبر ۲)

۷۔ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ہدایت اور صاحبانِ ایمان کے لئے بشارت ہے (سورہ البقرہ ۲ : آیت نمبر ۹۷)

۸۔ هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ جوان نیک کردار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے (سورہ لقمان ۳۱ : آیت نمبر ۳)

۹۔ ملاحظہ کریں : معرفت، بغیر تاریخ، ج ۳، ص ۲۱۴

۱۰۔ الانعام ۶ : آیت نمبر ۱۳۲

سورہ یوسف (ع) میں احسان اور الٰہی علم کی عنایت کے درمیان تعلق

: احسان اور علم و حکمت کے درمیان باہمی تعلق قرآن کی متعدد آیات میں واضح ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ احسان اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت کا سبب بنتا ہے، جو بعض اوقات علم و حکمت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

محدودیت کے پیش نظر، یہاں صرف سورہ یوسف کی چند منتخب آیات پیش کی جا رہی ہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ[۱]؛ اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انہیں علم اور حکمت عطا کی اور ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔

اس آیت میں چار اہم نکات زیر بحث ہیں: - ﴿آتَيْنَاهُ﴾ (﴿حُكْمًا﴾ ﴿عِلْمًا﴾ ﴿محسنين﴾ ﴿كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾

ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

﴿آتَيْنَاهُ: یعنی "ہم نے اسے عطا کیا"۔ یہ ایک غیر مرئی اور غیر تجربی طور پر اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔ ظاہری طور پر یوسفؑ نے خود سمجھا ہوگا، لیکن آیت واضح کرتی ہے کہ یہ اللہ کی خاص عطا تھی۔ یہ ان دیکھی اور پس پردہ حقیقتیں ہیں۔ جیسا کہ قارون کے بارے میں آیا ہے کہ اس نے کہا: قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (قارون نے کہا: یہ سب مجھے اس مہارت کی بنا پر ملا ہے جو مجھے حاصل ہے)[۲]"، حالانکہ درحقیقت یہ اللہ کی طرف سے تھی۔

زمخشری لکھتے ہیں: "چونکہ حضرت یوسفؑ عمل میں نیک اور جوانی میں پرہیزگار تھے، اس لیے وہ اللہ کی خاص توجہ کے مستحق ٹھہرے، اور اسی خوبی کی وجہ سے اللہ نے انہیں حکمت اور علم عطا فرمایا"۔[۳]

﴿حُكْم﴾ (حکمت): "حکمت، علم سے مختلف ہے۔ علم تو محض جاننا ہے، جبکہ حکمت ایک بصیرت ہے جو انسان کو حق تک پہنچاتی ہے"[۴]۔ نیز یہ "روکنے" کے معنی میں بھی ہے، اسی لیے اسے حکمت کہتے ہیں کیونکہ یہ جہالت کو روکتی ہے۔[۵]

"حکم سے مراد وہ الٰہی حکمتیں (عملی) اور حکیمانہ کلمات و آثار ہیں، جیسا کہ لقمان کو عطا کی

۱۔ سورہ یوسف ۱۲: آیت نمبر ۲۲

۲۔ القصص ۲۸: آیت نمبر ۷۸

۳۔ ملاحظہ کریں: زمخشری، ۱۴۰۷ھ، ج ۲، ص ۴۵۴

۴۔ راغب اصفہانی، ۱۹۹۵، ج ۱، ص ۵۲۸

۵۔ ابن فارس، ۱۴۲۲ھ، ج ۲، ص ۹۱

گئی حکمت : وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ[۱] ؛(اور بتحقیق ہم نے لقمان کو حکمت سے نوازا کہ اللہ کا شکر کریں[۲]"۔

"جب فرمایا : ﴿آتَيْنَاهُ حُكْماً﴾ تو لغت کی کتابوں کے مطابق [حکم] ہر معاملے میں فیصلہ کن اور حق بات کہنے کے معنیٰ میں ہے، نیز شک و تردید کو دور کرنے کے معنیٰ میں بھی ہے ان امور میں جو اختلاف کا شکار ہوں۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ تمام انسانی معارف میں، خواہ وہ ابتداء خلقت سے متعلق ہوں یا آخر (معاد) سے... حکمت رکھنے والے کو درست اور قطعی رائے کا مالک ہونا چاہیے۔

اور سورہ یوسف کی آیت ۴۰-۴۱ (إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ) ؛اقتدار تو صرف اللہ ہی کا ہے (قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ) : جو بات تم دونوں مجھ سے دریافت کر رہے تھے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ سے سمجھ آتا ہے کہ یہ حکم جو اللہ نے یوسفؑ کو دیا تھا در حقیقت اللہ کا ہی حکم تھا، یعنی یوسفؑ کا حکم اللہ کا حکم تھا[۳]"۔ جو پروردگار کی طرف سے حضرت یوسفؑ کے احسان، ہوشیاری اور سیلف کنٹرول کی وجہ سے ان پر نازل ہوا تھا۔

حکم دراصل علم کو موضوع پر منطبق کرنا ہے۔ یہ کہ فلاں موضوع پر کوئی حکم لاگو ہوتا ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہو سکتا ہے۔ علمی اعتبار سے دو افراد ایک چیز کو تسلیم کر سکتے ہیں، لیکن عملی طور پر، اس کے اطلاق و نفاذ میں ان کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو سکتا ہے۔

علم: علم کو "کسی چیز کی حقیقت کو پا لینے" کا نام دیا گیا ہے[۴]۔ سورہ بقرہ آیت ۱۵۱ میں ہے : "(وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ)؛اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ اس سے مراد "خاص دانش اور مخصوص معرفت" ہے[۵]۔ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں : "علم محض سیکھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک نور ہے جو اس شخص کے دل میں قرار پاتا ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ ہدایت دینا چاہے۔ اگر تم علم چاہتے ہو تو پہلے اپنے نفس میں بندگی کی حقیقت تلاش کرو، اور علم کو اس پر عمل کر کے حاصل کرو، اور اللہ سے سمجھ مانگو تو وہ تمہیں سمجھ عطا فرمائے گا...[۶]"۔

۱۔ سورہ لقمان ۳۱ : آیت نمبر ۱۲

۲۔ جوادی آملی، ۲۰۱۶، ج ۴۰، ص ۲۹۲

۳۔ طباطبائی، ۱۹۹۵/۹۶، ج ۱۱، ص ۱۵۹

۴۔ راغب، ۱۳۷۴، ج ۲، ص ۶۳۴

۵۔ جوادی آملی، ۲۰۱۶، ج ۴۰، ص ۲۹۲

۶۔ طبرسی، ۱۴۲۳ھ، ج ۲، ص ۳۲۱

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن و روایات میں علم کو محض ظاہری معلومات کا ذخیرہ نہیں سمجھا گیا، بلکہ یہ ایک الہام شدہ نور ہے جو تقویٰ، بندگی اور عمل صالح کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ خاص علم ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے محسن و نیک و سخی و مہربان بندوں کو عطا فرماتا ہے، جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے واقعہ میں بیان ہوا ہے۔

علامہ طباطبائیؒ سورہ یوسف کی آیت ۲۲ کے بارے میں رقم طراز ہیں: "اور جب حکم کے بعد فرمایا: 'اور علم'، تو چونکہ یہ وہ علم ہے جو اللہ نے اسے عطا کیا ہے، یقیناً یہ جہالت سے مخلوط نہیں ہے۔ اب یہ کس نوعیت کا علم ہے اور کس مقدار میں ہے، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ جو کچھ بھی ہے، یہ خالص علم ہے اور نفسانی خواہشات یا شیطانی وسوسوں سے آلودہ نہیں۔ کیونکہ یہ معقول نہیں کہ یہ جہالت یا نفسانی خواہشات سے مخلوط ہو، جبکہ اسے اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور دینے والے کو اللہ قرار دیا گیا ہے[۱]۔

فخر رازی بھی حضرت یوسفؑ کو عطا کردہ علم کی نوعیت کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں: "یوسفؑ کو جو علم عطا کیا گیا، وہ ایسا علم ہے جس میں جہالت کی کوئی گنجائش نہیں۔ بعض اسے 'دینی علم' یا 'نظری دانش' یا 'عالم ملکوت کے قدسی انوار' قرار دیتے ہیں جو انسان کے دل پر تاباں ہوتے ہیں[۲]"۔ چنانچہ، وہ علم جو ہر قسم کے احسان اور نیک عمل کی تمہید ہے، وہ "علم حصولی" (وہ علم جو عام رائج طریقوں (مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ) سے حاصل کیا جاتا ہے) ہے۔ لیکن جو علم محسنین کو عطا کیا جاتا ہے، وہ ایک خاص قسم کا الٰہی علم ہے اللہ کی خاص عنایت اور نور سے عبارت ہے (علم لدنی: وہ خاص علم جو اللہ کی طرف سے بطور موہبت عطا ہوتا ہے)۔

محسنین: اصل لفظ "محسنین" "حسن" یا "احسان" سے ماخوذ ہے، جو افعال کے باب سے ہے۔ الفاظ "حُکماً وَعِلماً" اور "المُحسِنِینَ" کا ایک ساتھ ذکر ان کے درمیان گہرے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ احسان، علم کے حصول کا سبب و علت ہے۔

آیت اللہ جوادی آملی، حکم کے علم پر مقدم ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: (آتَیْنَاهُ حُکْمًا وَعِلْمًا)[۳]: بے شک! بعض لوگ علم حاصل کرنے، حلال و حرام،

۱۔ طباطبائی، ۱۹۹۵/۹۶، ج ۱۱، ص ۱۵۹

۲۔ ایضاً اور فخر رازی، بیتا، ج ۱۸، ص ۴۵۶

۳۔ سورہ یوسف ۱۲: آیت نمبر ۲۲

خوبصورت و بدصورت، صحیح و غلط کو جاننے کے بعد نفس کی اصلاح، پاکیزگی اور تربیت و ادب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں؛ لیکن کچھ لوگ تزکیہ، طہارت و اصلاح نفس، کے بعد علم حاصل کرتے ہیں اور عالم بنتے ہیں، اور اس راستے سے حاصل ہونے والا علم زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اسی راستے سے علم حاصل کیا۔ انہوں نے بے شمار آزمائشوں اور مصیبتوں پر صبر کیا، اور اللہ نے ان پر علم کے دروازے کھول دیے[1]۔"

لہٰذا، خلوص کے ساتھ احسان اور نیکی کرنا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے محسنین کو علم و حکمت عطا ہونے کا سبب بنتی ہے۔

(وَ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ[2])؛اور ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں؛

خداوند متعال نے حضرت یوسفؑ کو ان کے احسان، نیکی، مہربانی اور اچھے سلوک کی صفت کی وجہ سے خاص علم عطا فرمایا۔ یہ اللہ کے سنتوں میں سے ہے جو صرف انبیاءؑ تک محدود نہیں، بلکہ ایک عمومی اصول ہے جو تمام نیک مومنین پر لاگو ہو سکتا ہے۔ انبیاءؑ کے علاوہ بھی، دیگر نیک طلباء اور سیکھنے والوں پر اللہ کی حکمت اور علم کی عطا کو کئی طریقوں سے سمجھا جا سکتا ہے:

الف) پہلی آیت میں صراحتاً یہ قاعدہ بیان ہوا ہے: (وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ)؛ (اور ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں)۔

لفظ ﴿كَذَلِكَ (اسی طرح...) خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو ان کے محسن ہونے کی وجہ سے علم و حکمت سے نوازا، اسی طرح وہ دیگر نیکوکاروں کو بھی جو احسان کی صفت رکھتے ہوں، علم و حکمت عطا فرمائے گا۔

یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مسلمہ اصول ہے جو صرف انبیاء تک محدود نہیں، بلکہ ہر اس بندے پر لاگو ہوتا ہے جو اخلاص کے ساتھ نیکی کی راہ پر چلے۔ اس آیت میں "كَذَلِكَ" کا استعمال بتاتا ہے کہ یہ ایک مستقل سنت الٰہی ہے جو ہر زمانے میں محسنین کے لیے جاری رہتی ہے۔

۱۔ جوادی آملی، ۲۰۱۶، ج ۴۰، ص ۲۹۴

۲۔ سورہ یوسف ۱۲: آیت نمبر ۲۲

ب) "قاعدہ بطن" کو بروئے کار لاتے ہوئے، آیت میں بیان شدہ خاص جزئیات سے صرف نظر کرتے ہوئے، ایک قاعدہ اخذ کیا جا سکتا ہے، اور وہ یہ ہے :

"ہر مومن انسان جو خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے بندوں پر احسان کرتا رہے، اللہ تعالیٰ اپنے خاص علم سے اسے رزق عطا فرماتا ہے۔" یعنی جو شخص مقامِ احسان تک پہنچ جائے اور محسن بن جائے، وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ علم آتَيْنَاهُ کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

یہ قاعدہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ احسان محض ایک اخلاقی خوبی نہیں، بلکہ ایک روحانی مقام ہے جو انسان کو الٰہی علوم کے حصول کی اہلیت بخشتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسفؑ کے واقعے میں دیکھا جا سکتا ہے، ان کے احسان اور صبر کے بدلے میں اللہ نے انہیں خاص علم سے نوازا۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو اخلاص کے ساتھ اللہ کی راہ میں احسان کرتا ہے، وہ بھی اس رحمت الٰہی کا مستحق بن سکتا ہے۔

یہ بات قرآن کے اس اصول پر مبنی ہے کہ (مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا)؛ جو شخص نیکی لے کر آئے گا اسے اس سے بہتر اجر ملے گا[۱]۔ احسان کرنے والوں کے لیے یہ "بہتر جزا" کبھی ظاہری شکل میں ہوتی ہے تو کبھی باطنی علم و حکمت کی صورت میں۔

ب) احسان اور الٰہی علم کے باہمی تعلق کے بارے میں، مفسرین کے اقوال :

"یہ الٰہی نوازشیں اور عطایا جو کبھی کبھی بعض لوگوں کو عطا کی جاتی ہیں، بلاوجہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ افراد جنہیں یہ علم و حکمت دی جاتی ہے، ان کی ذات اور نفس بہت مختلف ہوتے ہیں۔ دوسرے نفوس) ممکن ہے) خطاکار، تاریک اور جاہل ہوں، جبکہ یہ نفوس ایسے نہیں ہوتے؛ پاکیزہ زمین اپنی پیداوار اپنے رب کے حکم سے نکالتی ہے، جبکہ ناپاک زمین سے سوائے ناموزوں چیز کے کچھ نہیں نکلتا۔[۲]

(وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ)؛ اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو جزا دیتے ہیں[۳]۔ اس آیت میں تشبیہ کا پہلو یہ ہے کہ جس طرح ہم نے یوسفؑ کو جزا دی، اسی طرح دوسرے نیک و پرہیزگار لوگوں کو بھی جزا دیں گے[۴]۔

۱۔ سورہ نمل، ۲۷ : آیت نمبر ۸۹

۲۔ الاعراف : ۵۸/طباطبائی، ۱۹۹۵/۹۶، ج ۱۱، ص ۱۵۹

۳۔ سورہ یوسف ۱۲ : آیت نمبر ۲۲

۴۔ ابوالفتوح رازی، ۱۴۰۸ھ، ج ۱۱، ص ۴۲

تفسیر نمونہ میں بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے : "یہ حکم اور یہ علم جو یوسفؑ کو دیا گیا تھا، کوئی ابتدائی عطا نہیں تھی، بلکہ انہیں ان کے نیک، متقی و مہربان ہونے کے صلے میں دیا گیا تھا۔ بعید نہیں کہ اس سے یہ بھی مستفاد ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ علم و حکمت تمام نیکوکاروں کو عطا فرماتا ہے، البتہ ہر شخص کو اس کی نیکی، بھلائی، مروت اور مہربانی کے بقدر ملتا ہے"[1]۔

آیت اللہ جوادی آملی لکھتے ہیں :

قرآن کریم انسان کو دی جانے والی اللہ کی نعمتوں میں سے بعض کو اس کے پچھلے نیک اعمال کا نتیجہ سمجھتا ہے : (وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ)۔ حضرت یوسفؑ کو حکمت اور علم دینے والی نعمت ان کے پچھلے نیک اعمال جیسے کہ ان کا صبر اور صبر و تحمل کنوئیں میں اور ان کے امتحانات میں ثابت قدم رہنے کا بدلہ ہے۔

یہ تعبیر عام ہے؛ یعنی اس قسم کے انعامات ہر اچھے، محسن، نیک، پاک دامن، صالح، سخی اور کریم انسان کے لیے ہیں اور یہ صرف حضرت یوسفؑ کے بارے میں نہیں ہے۔ جو شخص بھی اللہ کے امتحانات میں اپنی مرضی سے حق کے راستے پر چلتا ہے اور اللہ کے حکم کی اطاعت کرتا ہے اور نفسانی خواہشات کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا، اللہ کی مدد اس کے راستے میں شامل ہوگی[2]۔

اللہ کی عمومی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کی کوششوں کو ضائع نہیں کرتا : (وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ)[3]؛ اور یہ کہ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ سعی کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے اللہ کی عنایات سے استفادہ کرنے کے لیے ایک اہم عامل جہاد کو قرار دیا ہے اور اس میں فرمایا : (وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ)[4]؛ اور جو ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم انہیں ضرور اپنے راستے کی ہدایت کریں گے اور بتحقیق اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور (وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ)[5]؛ ور اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کرے گا۔

۱۔ مکارم شیرازی، ۱۳۷۱ھ، ج ۹، ص ۳۶۵
۲۔ اللیل /۵-۷/ جوادی آملی، ۲۰۱۶، ج ۴۰، ص ۲۹۵
۳۔ سورہ نجم ۵۳ : آیت نمبر ۳۹
۴۔ سورہ عنکبوت ۲۹ : آیت نمبر ۶۹
۵۔ سورہ حج : آیت نمبر ۴۰

علامہ مصباح یزدیؒ جہاد کے وسیع مفہوم کی وضاحت پر فرماتے ہیں :

اللہ کی مدد صرف فوجی میدان تک محدود نہیں ہے۔ آج کے دور میں اللہ کی مدد ثقافتی میدانوں میں فوجی میدان سے زیادہ اہم ہے۔ جو اللہ فوجی محاذ پر ہے، وہی اللہ تعلیٰ یونیورسٹی اور مدرسہ کا بھی ہے اور جیسے وہ محاذ پر، دل و جان سے محنت کرنے والے فوجیوں کو غیبی مدد پہنچاتا ہے، ویسے ہی ثقافتی محاذ پر بھی اگر لوگ خلوص کے ساتھ کام کریں گے تو اللہ ان کو غیبی مدد دے گا۔ بعض اوقات ان کے ذہن میں خیالات آتے ہیں، چمکدار خیالات آتے ہیں اور انہیں عالم غیب سے الہام ملتا ہے، بعض اوقات ان کی محنتوں اور مشکلات کی وجہ سے مسائل ان کے ذہن میں آتے ہیں جو ہزاروں جسمانی محنت اور بیرونی وسائل سے حاصل نہیں ہوتے۔ بہرحال، اللہ کی مختلف رنگوں اور قسموں کی غیبی مدد اور اس کی نصرت ایک حقیقت ہے اور ہمیں اللہ کے وعدے پر یقین رکھنا چاہیے : (إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ)[1]؛ "اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔" ہم اس وعدے کی عمومی اور اطلاقی حقیقت پر یقین کرنا چاہیے[2]۔

نتیجے کے طور پر، احسان وہ عامل ہے جو طالب علم کو علم الٰہی تک پہنچاتا ہے؛ اس لیے ہمیں احسان، نیکی، بھلائی، اچھائی اور سخاوت مندی والا نیک اور صالح بندہ بننا چاہیے؛ تاکہ اللہ کی خاص انعامات کے قابل بنیں۔ جو شخص علمی اور جسمانی قوت رکھتا ہو، وہ اللہ کی رحمت کا مستحق نہیں ہوتا، بلکہ محسن، نیک، متقی اور پرہیزگار ہونا بھی ضروری ہے۔"۔ یہ اس کو علم کے جدید نتائج تک پہنچائے گی اور علمی مسائل کے حل میں اس کی مدد کرے گی

اس آیت میں موجود الفاظ، پہلی آیت کی طرح ہیں اور پہلے آیت کے ذیل میں ان پر بات کی گئی تھی، اور اب دوسری آیت کی تفسیر اور اس کا تربیتی پہلو بیان کیا جاتا ہے۔

اس آیت میں بھی علم اور احسان کے درمیان تعلق دکھائی دیتا ہے۔ قید سے رہائی پانے والا، حضرت یوسفؑ سے اپنے خواب کی تعبیر چاہتا ہے اور حضرت یوسفؑ کے پاس جانے کی وجہ کو ان کے محسن اور نیک ہونے کو ذکر کرتا ہے۔

۱۔ سورہ محمد، ۴۷: آیت نمبر ۷

۲۔ مصباح یزدی، ۲۰۱۵، ص ۳۲

(نَبِّئۡنَا بِتَأۡوِيلِهِۦٓۖ إِنَّا نَرَىٰكَ مِنَ ٱلۡمُحۡسِنِينَ)[1]؛ ہمیں اس کی تاویل بتا دیجئے، یقیناً ہمیں آپ نیک انسان نظر آتے ہیں۔

نکتہ: قیدیوں کے حضرت یوسفؑ کی طرف رجوع کرنے کی وجہ کے بارے میں دو احتمالات ہیں:

پہلا احتمال: "محسن" سے مراد عام نیک، متقی، پرہیزگار اور اچھا انسان ہونا ہے جو دوسروں کے ساتھ بھی بھلائی کرتا ہے۔

دوسرا احتمال: یہاں "محسن" سے مراد محض عالم ہونے سے بڑھ کر ماہر فن ہونا ہے[2]۔ یہ صرف جاننے سے بالاتر درجہ ہے۔ (نَبِّئۡنَا بِتَأۡوِيلِهِ)؛ ہمیں اس کی تعبیر بتائیں" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیدی حضرت یوسفؑ کے پاس اس لیے آئے کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ آپ خوابوں کی تعبیر میں ماہر ہیں[3]۔

تجزیہ:

ایسا لگتا ہے کہ اس آیت میں، دونوں احتمالات درست اور باہم مل سکتے ہیں۔ یوسفؑ ایک پیغمبر زادہ تھے، جن کا نفس و باطن پاکیزہ، مہذب، تربیت یافتہ اور اخلاقی کمالات سے آراستہ تھا۔ اس بلند شخصیت کے علاوہ، وہ دوسروں کے ساتھ بھلائی اور مہربانی کرنے والے بھی تھے (جیسا کہ روایات میں آیا ہے کہ وہ مخلوق خدا کے لیے بھلائی کے جذبات رکھتے تھے)۔ ان دو خوبیوں یعنی نیک ہونا اور سخاوت مندی کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کے خیر خواہ، مشاورت دینے والے راہنما بھی تھے، خاص طور پر خوابوں کی تعبیر کے ماہر۔ یہی وجہ تھی کہ قیدی ان کے پاس آئے اور خوابوں کی تعبیر پوچھی۔ البتہ بظاہر پہلا مفہوم مراد ہے کیونکہ دیگر آیات میں (ہم نیکو لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں) یہی خوابوں کی تعبیر کا علم اللہ کی طرف سے حضرت یوسفؑ کو ان کی نیکی کا صلہ مل سکتا ہے۔

۱۔ سورہ یوسف ۱۲: آیت نمبر ۳۶

۲۔ یہ معنی روایات میں بھی استعمال ہوا ہے۔

۳۔ طوسی، التبیان، بیتا، ج۶، ص۱۳۸؛ طبرسی، بیتا، ج۵، ص۳۵۶؛ جوادی آملی، ۲۰۱۶، ج۴۰، ص ۴۹۱-۴۹۳

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت یوسفؑ صفتِ احسان کے حامل تھے اور علم سے بھی بہرہ ور تھے۔ اس قیدی کے حضرت یوسفؑ سے مکالمے سے بھی احسان اور علم کے درمیان تعلق کا پتا چلتا ہے۔ حضرت یوسفؑ میں صفتِ احسان بہت نمایاں تھی؛ کیونکہ:

اوّلاً: قیدی نے "مُحْسِن" (اسم فاعل) کا استعمال کیا، جو اس صفت کے ثابت اور مستقل ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

ثانیاً: چونکہ قیدی نے علمی سوال کیا تھا، فطری طور پر کہنا چاہیے تھا: "ہم تمہیں علما میں سے دیکھتے ہیں"، لہٰذا ہمارے سوال کا جواب دو؛ لیکن اس نے ایسا نہیں کہا، بلکہ کہا: "ہم تمہیں محسنوں (اچھے اور نیک و مہربان انسانوں) میں سے دیکھتے ہیں"۔ اس نے "احسان" جیسے عام لفظ کو استعمال کیا جس کے متعدد مصادیق میں سے ایک "تعلیم" بھی ہے۔

حضرت علیؑ کا فرمان ہے: (قِیمَةُ کُلِّ امْرِئٍ مَا یُحْسِنُهُ)[1]؛ "ہر انسان کی قدر و قیمت اس چیز کے مطابق ہے جسے وہ اچھی طرح سے انجام دیتا ہے یا اس کا علم رکھتا ہے، یا علم و عملِ صالح دونوں، یا احسان و نیکی۔"

یہ دلیل قابلِ مشاہدہ ہے؛ کیونکہ جب کوئی انسان کسی چیز کا خواہشمند ہوتا ہے اور کسی ایسے فرد سے سامنا ہوتا ہے جس میں اس مطلوبہ شے کی علامات نظر آتی ہیں، تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ فرد اس چیز کا مالک ہے اور اس کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ مثلاً، ایک فقیر اگر کسی شخص کو قیمتی لباس یا مہنگی گاڑی میں دیکھے تو اس کے مالدار ہونے کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ اسی طرح دیگر امور میں بھی۔ یا دینی سوال رکھنے والا یا کوئی روحانی و نفسیاتی مشکل والا شخص جب کسی کو عمامہ، عبا و قبا وغیرہ میں دیکھتا ہے تو سمجھ جاتا ہے کہ یہ عالم دین ہے؛ لہٰذا اس سے اپنے سوال پوچھتا ہے۔ چنانچہ، اسی بنیاد پر، مزید چیزیں فرض کی جا سکتی ہیں۔

ظاہراً، جیل میں بھی یہی طبیعی سلسلہ پیش آیا۔ جب وہ قیدی، جنہوں نے خواب دیکھا تھا اور اس کی تعبیر جاننا چاہتے تھے، حضرت یوسفؑ میں ایسی خوبیاں دیکھتے تھے جیسے: تقویٰ، پرہیزگاری، حکمت آمیز گفتگو، محبت و شفقت... تو یہ سب ان پر اثر انداز ہوا۔

۱۔ بحار الأنوار، علامہ مجلسی، ج ۱، ص ۱۶۵

دوسری جانب چونکہ حضرت یوسفؑ اچھے اور نیک انسان تھے اور محبت و ہمدردی سکے ساتھ، دوسروں کو تعلیم دیتے تھے (مدرسی، ۱۴۱۹ق، ج۵، ص۱۸۰)، یہی سبب بنا کہ وہ قیدی ان کے پاس تعبیر خواب کے لیے گئے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ حضرت یوسفؑ ان کی طرح یا عام مجرموں جیسے بدتمیز و نافرمان نہیں ہیں، بلکہ ایک صالح، عبادت گزار، علم دوست، درگزر کرنے والے اور نیکی کرنے والے (محسن) انسان ہیں؛ لہٰذا، انہوں نے اپنی مشکل کے حل کے لیے انہی کی طرف رجوع کیا۔ لہٰذا، احسان سے مراد حضرت یوسفؑ کی شفقت اور بلند حوصلہ کے ساتھ تعلیم دینے کی خصوصیت ہے، کیونکہ انبیاء (ع) ہدایت کے لیے آئے تھے اور سب سے پہلے خود انہیں اعلیٰ کریمانہ اخلاق کا حامل ہونا چاہیے۔ اس آیت (یوسف: ۳۶) میں احسان کی ایک عملی نمونہ "درست مشورہ دینا" ہے۔ پاکیزہ نفس اور مہربان شخصیت والے لوگوں کی جانب دوسرے رجوع کرتے ہیں، اور اگر وہ عالم ہوں تو صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔

اس لیے علمی سوال پوچھنے کے لیے "محسنین" کا لفظ استعمال کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ احسان اور علم کے درمیان ایک ایسا تعلق ہے جو "وجہ اور اثر[۱]" کی نوعیت کا ہے۔ مذکورہ آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خاص علم و دانش صرف انبیاء الہیؑ ہی کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ دوسروں کو بھی عطا کیا جاتا ہے۔

۳۔ احسان کی مثالیں:

اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ احسان تعلیم و تربیت و سیکھنے کے عمل میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مناسب ہے کہ ہم دیکھیں کہ احسان کی کیا مثالیں ہیں؟ اس موضوع کو قرآن اور احادیث کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی جائے گی۔

۳(الف)۔ قرآن کریم میں احسان کی مثالیں:

قرآن میں احسان کے عملی نمونے آئے ہیں ان میں کچھ، انسان کی اندرونی اچھائی کو ظاہر کرتے ہیں جیسے: گناہوں سے دور رہنا- چاہے ماحول کتنا ہی آلودہ کیوں نہ ہو[۲]۔

۱- Cause and effect

۲۔ سورہ یوسف ۱۲: آیت نمبر ۲۳-۵۶

اللہ کے حکم کی اطاعت کرنا[۱] (الاعراف: ۱۶۱)، توبہ کرنا[۲] (آل عمران: ۱۴۶-۱۴۸)، غصہ پی جانا اور درگزر کرنا[۳] (آل عمران: ۱۳۴)، مشکلات برداشت کرنا، نبی اکرم (ص) کی اطاعت کرنا اور انہیں خود پر ترجیح دینا، حق پر چلنا چاہے کفار کے غصہ کا باعث بنے[۴] (التوبہ: ۱۲۰)، خالصانہ فی سبیل اللہ بھرپور کوشش کرنا[۵] (العنکبوت: ۶۹)، حق کو پہچاننا، اس پر ایمان لانا اور ثابت قدمی کی دعا کرنا[۶] (المائدہ: ۸۳-۸۵)، سچائی پر ثابت قدم رہنا[۷] (الزمر: ۳۳-۳۴)، فساد سے دوری اور خوف و امید کے ساتھ دعا کرنا[۸] (الاعراف: ۵۵)، اللہ کی رضا کی خاطر، اپنی محبوب ترین چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہنا[۹] (الصافات: ۱۰۰-۱۰۵)، اپنی خدائی ڈیوٹی انجام دینا: خطرات کے باوجود، طاغوت کو اللہ کی طرف بلانا[۱۰] (الصافات: ۱۱۴-۱۲۱)، تقویٰ الٰہی کی راہ پر استقامت[۱۱] (المرسلات: ۴۱-۴۴)، قیدیوں کو آزاد کرانا، صلح کرانا، شیطان کی چالوں کو ناکام بنانا[۱۲] (یوسف: ۱۰۰)، اللہ کی راہ میں انفاق کرنا۔

۱۔ وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ

۲۔ وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿﴾ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۳۔ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۴۔ مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۰﴾

۵۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۶۔ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ﴿﴾ فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۷۔ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿﴾ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۸۔ ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿﴾

۹۔ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۰۰﴾ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ﴿۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ﴿۰﴾ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ﴿۰﴾ وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ ﴿۰﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا ۚ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۰﴾

۱۰۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿﴾ وَنَجَّيْنَاهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ﴿﴾ وَنَصَرْنَاهُمْ فَكَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ﴿﴾ وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ ﴿﴾ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْآخِرِينَ ﴿﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ مُوسَىٰ وَهَارُونَ ﴿۰﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۱۱۔ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ ﴿﴾ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۱۲۔ وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا ۖ وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا ۖ وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ مِن بَعْدِ أَن نَّزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي ۚ إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۰۰﴾

اسی طرح سے قرآن میں، احسان کی عملی نمونے ہیں جو خدمت خلق سے متعلق ہیں جیسے: صبر کے ساتھ دوسروں کو تعلیم دینا اور ان کے افکار کو بیدار کرنا تاکہ وہ شرک اور بت پرستی سے دور ہوں[۱] (الانعام: ۷۴-۸۴)، خالص خدا کی رضا کیلئے تعلیم دینا (خالص خدا کی رضا کیلئے تعلیم دینا)، معاشرتی مسائل کے حل کے لیے اپنی صلاحیتیں پیش کرنے میں پیش قدم ہونا[۲] (یوسف: ۲۳-۵۶) اپنی استطاعت کے مطابق ہدیہ دینا[۳] (البقرہ: ۲۳۶)، اللہ کی راہ میں انفاق کرنا[۴] (البقرہ: ۱۹۵)، واجب جہاد میں شرکت کرنا[۵] (آل عمران: ۱۴۶-۱۴۸)، سخاوت، حقوق العباد ادا کرنا، اچھی مہمان نوازی[۶] (یوسف: ۵۸-۷۸)

۳(ب)۔ روایات میں احسان کی چند مثالیں

روایات میں احسان (نیکی) کی کئی صورتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

۱۔ تعلیم دینا: حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "العلم یزکو علی الانفاق[۷]"؛ "علم سکھانے سے پاکیزہ ہوتا ہے اور بڑھتا ہے"۔ اصلاح، پختگی اور علمی ترقی کا باعث ہے

۲۔ اپنے علم پر عمل کرنا: حضرت امام باقرؑ فرماتے ہیں: "من عمل بما یعلم علمه الله ما لم یعلم"؛ "جو شخص اپنے علم کے مطابق عمل کرے گا، اللہ اسے وہ علم عطا فرمائے گا جو وہ نہیں جانتا[۸]"۔

۱۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿﴾ وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ..... وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَمِن ذُرِّيَّتِهِ دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۲۔ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ..... وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَن نَّشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۳۔ لَّا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۴۔ وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَأَحْسِنُوا ۛ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۵۔ وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿﴾ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۶۔ وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ﴿﴾ ..... قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

۷۔ حرانی، ۱۳۸۲، ص ۲۸۰

۸۔ المجلسی، ۱۴۰۳ق، ج ۷۵، ص ۱۸۹

۳۔ صدقہ دینا: امام رضاؑ فرماتے ہیں: «مُرِ الصَّبِيَّ فَلْيَتَصَدَّقْ بِيَدِهِ...»؛ بچے کو حکم دو کہ اپنے ہاتھ سے صدقہ دے، چاہے روٹی کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو[۱]"۔
۴۔ دیگر موارد:- خود قرضہ لے کر، کسی دوسرے محتاج کی ضرورت کو پورا کرنا، کمزور انسان کی مدد کرنا، مجلس میں جگہ بنانا، بیماروں کی تیمارداری کرنا، درگزر کرنا، علمی مدد فراہم کرنا[۲]
نکتہ: احسان کچھ مراحل پر مشتمل ہے۔ احسان کا پہلا مرحلہ، انسان ایک ذاتی اور داخلی مسئلہ ہے جو دوسرے مرحلہ میں بعد میں بیرونی دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔
وہ داخلی مرحلہ اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین ہے- اللہ کو حاضر و ناظر سمجھنا اور پھر اللہ کے لیے کام کرنا۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے "احسان" کی تعریف میں فرمایا:
«الاحسان ان تعمل لله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك»؛ "احسان یہ ہے کہ تو اللہ کے لیے اس طرح کام کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہیں دیکھتا (تو جان لے کہ) وہ تجھے دیکھ رہا ہے[۳]"۔ یہی احسان کی حقیقی روح ہے!
چنانچہ، جہاں احسان "الی" کے ساتھ آیا ہے وہاں دوسروں کے ساتھ نیکی مراد ہے۔- جہاں اکیلا احسان آیا ہے اسے اس حدیث پر لاگو کیا جا سکتا ہے[۴]
احسان کے نمونوں پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیکھنے والا اس کاروائی میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ ان نمونوں میں سے کچھ فرد کے باطنی پاکیزگی، تربیت اور نیک ہونے سے متعلق ہیں، جبکہ کچھ، دوسروں کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک سے تعلق رکھتے ہیں۔ روایات کی رو سے، محسنین کی بعض صفات ان کی شخصیت کی داخلی خوبیاں ہیں جیسے اپنے علم پر عمل کرنا، خدا کو حاضر و ناظر جاننا۔ اور بعض صفات معاشرتی ہیں جیسے: تعلیم، مشاورت، راہنمائی، بچوں کو صدقہ اور نیکوکاری کی تربیت دینا، خود قرضہ لے کر، کسی محتاج کی ضرورت کو پورا کرنا، کمزوروں کی امداد کرنا، بیماروں کی دیکھ بھال کرنا، معاف کرنا شاگرد- محور تعلیمی ماڈل میں احسان کے اثرات کو واضح کیا جاتا ہے، جہاں ٹیچر، سرپرست و مربی کی ذمہ داری زمین ہموار کرنا، بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنا، مدد کرنا، نگرانی کرنا، ترقی کا جائزہ لینا اور سیکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

۱۔ الکلینی، ۱۳۶۵، ج ۴، ص ۱۰
۲۔ الکلینی، ۱۳۶۵، ج ۲، ص ۶۳۷؛ القمی، ۱۴۲۸ق، ص ۲۸۰؛ یوسف: ۳۶ و ۵۹
۳۔ مجلسی، ۱۴۰۳، ج ۶۷، ص ۱۹۶
۴۔ شعرانی، ۱۳۹۸، ج ۱، ص ۱۷۳

اس کا مقصد یہ ہے کہ سیکھنے والا شاگرد خود اپنی کوششوں سے علم حاصل کرے، اس پر عمل کرے،، اور مخلوق خدا کے ساتھ مہربانی اور خیر خواہی کا رویہ اپنائے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط بنائے۔

سیکھنے والے کو بھی تعلیم و تربیت کے عمل و پراسس میں اپنے کردار کا احساس ہونا چاہیے اور اسے بہترین طریقے سے نبھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اللہ سے تعلق، ایمان، تقویٰ، اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور مخلصانہ مہربانی اسے رفتہ رفتہ، احسان کے مقام تک پہنچاتی ہے اور خدا کی جانب سے الہام اور خاص ہدایت حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔

امام خامنہ ای اخلاص کے بارے میں فرماتے ہیں: "یہ کہ انسان چاہے کہ اس کی تعریف کی جائے، شیطان کے لئے، بہترین مواقع میں سے ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ شیطان آتا ہے اور نیک، اچھے اور باتقوا محسنین کے احسان اور بھلائی کو ختم کر دیتا ہے، یعنی وہ نیکیوں، خوبصورتیوں اور روحانی کمالات و اخلاق کو تم سے چھین لیتا ہے (رہبر معظم حسینی خامنہ ای، کابینہ کے اراکین سے ملاقات میں بیانات" (۲۰۰۵/۱۰/۹) .https://khl

«-(۳۳۱۳/ink/f

نتیجہ:

قرآن کریم میں تربیتی نفسیات (Educational Psychlogy) سے کہیں بڑھ کر، شاگرد مدار تعلیمی طریقے ہیں۔ قرآن میں رائج طریقوں کے علاوہ، اخلاقی-روحانی طریقوں پر بھی زور دیتا ہے جو انسان کو حقیقی علم تک پہنچاتے ہیں، جیسے: تقویٰ[۱] (البقرہ: ۲۸۲)، ایمان[۲] (الکھف: ۱۳)، احسان[۳] (یوسف: ۲۲)۔ اس تحقیق میں، تعلیم و تربیت میں، خاص طور پر "احسان" کے کردار کو پرکھا گیا۔ خالص احسان ربانی الہام کے لیے زینہ ساز بن سکتا ہے۔

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا ۚ وَلَا تَسْأَمُوا أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَىٰ أَلَّا تَرْتَابُوا ۖ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿﴾

۲۔ نَّحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ ۚ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ﴿﴾

۳۔ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿﴾

یہ کیفیت اُن باکمال افراد میں دیکھی گئی جو علم کے ساتھ ساتھ احسان سے بھی آراستہ تھے، اور جن کے ذریعے بعض اوقات علمی اختراعات بھی وجود میں آئیں۔ روایات میں اس ضمن میں جو اعمال بیان کیے گئے ہیں، ان میں شامل ہیں: اللہ تعالیٰ سے خالص تعلق، عبادت و بندگی، چنانچہ، احسان ایک جامع تصور ہے جو باطنی طہارت و تربیت، تزکیہ، تہذیب نفس، اپنے علم پر عمل، اللہ سے تعلق اور مخلوق خدا کے ساتھ، فی سبیل اللہ، حسن سلوک اور بھلائی پر مشتمل ہے۔ احسان باعث بنتا ہے کہ تعلیم و تربیت میں، احسان پر فائز شاگرد عام رائج علوم و فہم سے مزید اعلیٰ مرحلہ پر جائے؛ یعنی خدا کی طرف سے خاص ہدایت کا مستحق ٹھہرے۔ تقویٰ، مریض کی عیادت، اخلاص سے تعلیم دینا، قیدی کو آزاد کرنا، دشمنوں کے ظلم سے روکنا، لوگوں کے درمیان صلح کروانا، اور دیگر انسان دوستانہ اقدامات۔

اِس تحقیق کو دیگر تحقیقات سے ممتاز بنانے والی بات یہ ہے کہ یہ مادی نکتۂ نظر پر مبنی موجودہ تعلیمی نظام کو روحانی اخلاقی پہلو کے ساتھ متوازن کرنے پر زور دیتی ہے۔ اساتذہ اور طالب علموں کو یاد دہانی کرواتی ہے کہ: "خالص عبادت، تقویٰ، صبر اور بے لوث نیکی، ربانی علم کے رزق کا ذریعہ بنتے ہیں۔" لہٰذا، تعلیمی عمل میں یہ اصول شامل ہونا چاہیے کہ اسٹوڈنٹس کو خالص بندگی، احسان اور اللہ کے بندوں سے نیکی کرنے کی طرف راغب کیا جائے، تاکہ وہ ظاہری علم کے ساتھ باطنی بصیرت اور الہامی حکمت سے بھی بہرہ مند ہو سکیں۔

کتابیات

قرآن کریم، ترجمہ: محسن علی نجفی، بلاغ القرآن، پاکستان، اسلام آباد، ویب سائٹ، ۲۰۲۵،
www.balaghulquran.com/balaghulquran.php

۱. ابن زکریا، ابی حسین احمد بن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، محقق: اصلان، انسہ فاطمہ محمد اور مرعب، محمد عوض۔ لبنان، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۲۰۰۱

۲. ابن منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، تیسرا ایڈیشن، لبنان، بیروت، دارصادر، ۱۹۹۳

۳. اسلاوین، رابرٹ ای، تعلیمی نفسیات، مترجم: یحییٰ سید محمدی، آٹھواں ایڈیشن، تہران، روان، ۲۰۰۶

۴. برومند، سید مہدی، قرآن و سنت میں تدریس کے طریقے، پہلا ایڈیشن، رشت، کتاب مبین پبلیکیشنز، ۲۰۰۹

۵. جعفر صادق (ع)، حدیث عنوان بصری، مترجم: صداقت، سید اکبر، دوسرا ایڈیشن، قم، رازبان پبلیکیشنز، ۲۰۰۷

۶۔ جوادی آملی، عبداللہ، تسنیم، جلد ۴۱ اور ۴۲، پہلا ایڈیشن، قم، اسراء پبلیشنگ سنٹر، ۲۰۱۶

۷۔ حرانی، ابن شعبہ، تحف العقول عن آل الرسول (ص)، ترجمہ و تحقیق: صادق حسن زادہ، پہلا ایڈیشن، ایران، قم، آل علی (ع) پبلیکیشنز، ۲۰۰۳

۸-دھخدا، علی اکبر، دہخدا میڈیم ڈکشنری، دوسرا ایڈیشن، تہران یونیورسٹی پبلیکیشنز، ۲۰۱۱

۹-. رازی، ابوالفتوح، روض الجنان و روح الجنان فی تفسیر القرآن، پہلا ایڈیشن، مشہد، آستان قدس رضوی، اسلامی ریسرچ فاؤنڈیشن، ۱۹۸۷

۱۰۔ راغب اصفہانی، حسین، قرآن کے الفاظ کی لغت، ترجمہ و تحقیق: غلامرضا خسروی حسینی، دوسرا ایڈیشن، تہران، مرتضوی، ۱۹۹۵

۱۱. زمخشری، محمود بن عمر، الکشاف، تیسرا ایڈیشن، لبنان، بیروت، دارالکتب العلمیہ، ۱۹۸۶

۱۲. سیف، علی اکبر، جدید تعلیمی نفسیات، بارہواں ایڈیشن، چھٹی نظر ثانی، تہران، دوران، ۲۰۱۱

۱۳. ----------، ساتویں نظر ثانی، چھٹا ایڈیشن، تہران، دوران، ۲۰۱۳

۱۴۔ شریعتداری، علی، تربیتی اور علمی مراکز تعلیم کی رسالت، پانچواں ایڈیشن، قم، سمت، ۱۲/۲۰۱۱

۱۵۔ شعرانی، ابوالحسن، نشر طوبیٰ، کتاب فروشی اسلامیہ، تہران، ۷۹/۱۹۷۸

۱۶۔ صفائی حائری، بہار رویش، قم، لیلۃ القدر، ۱۳/۲۰۱۲

۱۷۔ ----------، حرکت، دوسرا ایڈیشن، قم، لیلۃ القدر، ۰۸/۲۰۰۷

۱۸۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ترجمہ: محمد باقر موسوی ہمدانی، پانچواں ایڈیشن، قم، دفتر نشر اسلامی، ۹۶/۱۹۹۵

۱۹۔ طبرسی، علی بن حسن، مشکاۃ الأنوار فی غرر الأخبار، پہلا ایڈیشن، ایران، قم، موسسہ آل البیت لإحیاء التراث، جلد ۲، ۰۳/۲۰۰۲

۲۰۔ طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان، مترجم: حسین نوری ہمدانی و دیگر، پہلا ایڈیشن، تہران، فراہانی، بغیر تاریخ۔

۲۱۔ طوسی، محمد بن حسن، التبیان فی تفسیر القرآن، لبنان، بیروت، داراحیاء التراث العربی، بغیر ایڈیشن و تاریخ۔

۲۲۔ عابدی، سید شعیب حیدر، قرآن کریم اور تعلیمی نفسیات کے تناظر میں تعلیمی ماڈل (استاد-مدار و شاگرد - پدار) کا تجزیہ و تطبیق، ڈاکٹریٹ کا تھیسز، رہنمائی: محمد رضا موسوی نسب، مدرسہ عالی قرآن و علوم جامعۃ المصطفیٰ (ص) العالمیہ، قم، ۲۰۱۹

۲۳۔ علی بن ابراہیم قمی، تفسیر قمی، تحقیق: شیخ محمد الصالحی، پہلا ایڈیشن، ایران، قم، ذوی القربی، ۰۸/۲۰۰۷

۲۴۔ فخر رازی، تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب)، لبنان، بیروت، مکتب تحقیق داراحیاء التراث العربی، بغیر تاریخ۔

۲۵۔ فراہیدی، خلیل بن احمد، کتاب العین، دوسرا ایڈیشن، قم، نشر ہجرت، ۱۹۸۸۔

۲۶۔ قرائتی، محسن، تفسیر نور، پہلا ایڈیشن، تہران، مرکز فرہنگی درس ہائی از قرآن، ۱۰/۲۰۰۹

۲۷۔ کاردان، علی محمد، تعلیمی علوم: اس کی نوعیت اور دائرہ کار، کئی مصنفین کے ساتھ، زیر نظر: کاردان، پانچواں ایڈیشن، تہران، سمت، ۱۲/۲۰۱۱

۲۸۔ کدیور، پروین، سیکھنے کی نفسیات: نظریہ سے عمل تک، پہلا ایڈیشن، تہران، سمت، ۱۴/۲۰۱۳

۲۹۔ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، تصحیح: محمد آخوندی و علی اکبر غفاری، تہران، دارالکتب الاسلامیہ، ۸۷/۱۹۸۶

۳۰۔ مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار، دوسرا ایڈیشن، لبنان، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۸۲ ۳۱۔ مدرسی، سید محمد تقی، من ہدی القرآن، پہلا ایڈیشن، ایران، تہران، دار محبی الحسین، ۱۹۹۸

۳۲۔ مصباح یزدی، محمد تقی، قرآن شناسی، تحقیق و تحریر: غلام علی عزیزی کیا، جلد دوم، چھٹا ایڈیشن، قم، مؤسسہ آموزشی و پژوہشی امام خمینی (قد)، ۲۰۱۵

۳۳۔ معرفت، محمد ہادی، علوم قرآنی، گیارہواں ایڈیشن، قم، تمہید، ۲۰۱۰

۳۴۔ ----------، التمہید (پرانا ایڈیشن)، ۶ جلدیں، قم، پہلا ایڈیشن، جماعۃ المدرسین، مؤسسہ النشر الاسلامی، بغیر تاریخ۔

۳۵۔ حسینی خامنہ ای، سید علی (مقام معظم رہبری)، [ویب سائٹ](https://farsi.khamenei.ir/)۔

filename: ShagirdMadar Taleemi ModelMay۲۰۲۵

LIST OF TOPICS

* The Message From The Supreme Leader Of The Islamic Revolution, Ayatollah Syed Ali Khamenei To The Seminar Held On The Occasion Of The Founding Anniversary Of The Qom Seminary
* The Most Important Characteristics Of Youth And In Islam Written By Dr. Muhammad Latif Mutahari
* A Comparative Analysis Of The Islamic Revolution Of Iran, The Russian Revolution, And The French Revolution Written By Qamar Abbas Nanji
* Individual And Collective Needs Of Man In The Light Of The Quran And Sunnah Written By Musa Khan
* The Knowledge Of The Prophets In The Holy Quran Written By Ghulam Mehdi Akhundzadeh
* Supporting The Oppressed And Jihad Against The Oppressor In The Light Of Nahjul Balagha Written By Muhammad Taqi Qazi
* According To The Quran, Ihsan And The (Student-Oriented) Educational Model Written By Sayyid Shoaib Abidi, Sayyid Mohammad Reza Mousavi Nasab

EDUCATION AND TRAINING

Specialized Scientific Magazine
April 2025 October ۲۰۲۵
All Rights Reserved to Al-Mustafa International University

Place Of Publication: Higher Jurisprudence Studies Complex
Editor-In-Chief :Dr Muhammad Latif Mutahari Kachuravi
Deputy Editor In Chief : Dr Shujat Ali Karimi
Address: Higher Jurisprudence Studies Complex, Hojjatiyah
St. Chahar Rah Shuhada, Qom, Iran

Education and Training

Specialized Scientific Magazine

Spring & Summer 2025

Proprietor: Al-Mustafa International University
Place of publication: Higher Jurisprudence Studies Complex
Editor-in-Chief : Muhammad latif mutahari kachuravi
Deputy editor in chief: shujat ali karimi
Address: Higher Jurisprudence Studies Complex, Madresa Hojjatiyah,
Hojjatiyah St. Chahar Rah Shuhada, Qom, Iran